توحید
کا
قرآنی تصور

الطاف احمد اعظمی



مجمع البحوث العلمیة الاسلامیة
زیر نگرانی
ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سنٹر
۸/۱ جوگابائی، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

توحید کا قرآنی تصوّر

الطاف احمد اعظمی



مجمع البحوث العلمیۃ الاسلامیۃ
زیر نگرانی
ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سنٹر
۸/۱ جوگابائی، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

سلسلۃ المطبوعات : (۱۲)

نام کتاب	:	توحید کا قرآنی تصوّر
مؤلف	:	الطاف احمد اعظمی
خوش نویس	:	سہیل احمد مَلِک
صفحات	:	۲۲۴
سن تالیف	:	۱۹۹۰ء
سن طباعت	:	۱۹۹۱ء

مجمع البحوث العلمیۃ الاسلامیۃ

زیر نگرانی

ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سنٹر

۸/۱ جوگابائی، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

انتساب

محب گرامی اشتیاق احمد صاحب (راشد اعظمی)
کے نام جن کی حوصلہ افزائیوں نے میرے علمی سفر
میں مہمیز کا کام کیا ہے

فہرست مضامین

نغمۂ توحید

خرامِ شام و سحر لا الٰہ الا اللہ
طلوعِ شمس و قمر لا الٰہ الا اللہ

ہے آفتاب کی گرمی کے ساتھ سایہ بھی
ظلالِ شاخِ شجر لا الٰہ الا اللہ

کہاں سے گل کو ملا رنگ و بو کا پیراہن
جہانِ گل کی خبر لا الٰہ الا اللہ

ملی کہاں سے پہاڑوں کو رفعتِ افلاک
سکوتِ ارض حجر لا الٰہ الا اللہ

چھپا دیا ہے تہِ خاک کس نے گنجینہ
متاعِ لعل و گہر لا الٰہ الا اللہ

ہر ایک چیز کی لذّت جدا ہے رنگ جدا
وجودِ کشت و ثمر لا الٰہ الا اللہ

حصارِ حزن و بلا میں کنارِ طوفاں میں
پکارتا ہے بشر لا الٰہ الا اللہ

نہ سیم و زر میں ملے گا نہ جام و ساغر میں
سکونِ قلب و نظر لا الٰہ الا اللہ

جہاں ہے ظلمتِ عقل و خرد میں سرگشتہ
چراغِ فکر و نظر لا الٰہ الا اللہ

ہر ایک شے کا مقدّر فنا سے وابستہ
ہر ایک شے سے حذر لا الٰہ الا اللہ

نہ تیغ پر ہو بھروسہ نہ خود پہ مومن کو
ہے اس کی تیغ و تبر لا الٰہ الا اللہ

اسی کے ہاتھ میں نفع و ضرر کا سر رشتہ
عبث ہے خوف و خطر لا الٰہ الا اللہ

نہ فکرِ زر کی کرو اعظمی نہ مرکب کی
ہے تیرا زادِ سفر لا الٰہ الا اللہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ
اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

قرآن کریم نے توحید کا جو تصوّر پیش کیا ہے وہ نہایت واضح، آسان اور عام فہم ہے لیکن فلسفہ وعلم کلام اور عجمی تصوّف کی رنگ آمیزیوں نے اس سیدھی سادی حقیقت کو بھی بحث ونزاع کا موضوع بنا دیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں فاضل مصنّف نے انھیں فکری لغزشوں کی نشاندہی کرکے توحید کے قرآنی تصوّر کو واضح اور سلیس انداز میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں پہلے توحید کے لغوی وشرعی معنی، توحید اسماء وصفات، توحید الوہیت اور توحید ربوبیت اور بعض شرعی اصطلاحات کی قرآنی آیات کی روشنی میں وضاحت کی ہے۔ اس کے بعد توحید کے عقلی دلائل اور اس کے تکوینی اور تشریعی تقاضوں سے بحث کی ہے اور اخیر میں توحید کی دعوتی حیثیت اور اس کی اہمیت واضح کرتے ہوئے علماء اور دینی جماعتوں کو اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے کی دعوت دی ہے۔

انسانیت کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ توحید کے علمبرداروں کا سوادِ اعظم بھی توحید کے صحیح معنی ومفہوم اور اس کے تقاضوں سے نا آشنا ہوگیا ہے، وہ اپنے حقیقی رب اور پالنہار کو چھوڑ کر بزرگانِ دین کے مزارات اور آستانوں کو اپنا مرکزِ عقیدت بنائے ہوئے ہے۔ اور ان کے سامنے اپنی جبینِ نیاز خم کرتا اور ان کو اپنا مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتا ہے۔

"اسلامک سائنٹفک ریسرچ اکیڈمی" کے قیام کا بنیادی مقصد ایسے لٹریچر کی اشاعت ہے جو اسلام اور اس کے عقائد وتعلیمات کی صحیح نمائندگی کرتا ہو اور ان کی شرح وتوضیح کے سلسلہ میں کتاب اللہ اور سنّتِ صحیحہ ہی کو آخری مرجع قرار دیتا ہو۔ حقیقتِ توحید کی وضاحت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں شرک اور مظاہرِ شرک سے نفرت کا جذبہ پیدا کیا جاسکے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا صحیح تصوّر ذہنوں میں اجاگر ہوسکے۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔

ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی علیگ ایک معتبر عالم اور مفکر ہیں، شرافت، مروت،

انسانیت اور متانت ووقار ان کی زندگی کے اہم عناصر ہیں۔ قرآن پاک کا انھوں نے ٹھوس اور گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ علی گڈھ کے ذہین اور تعمیری ذہن رکھنے والے فرزندوں میں سے ہیں، وہ ایک وسیع النظر عالم ہیں عصر حاضر کی اہم شخصیتوں اور عالمی تحریکوں کا انھوں نے بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

ڈاکٹر اعظمی صاحب علی گڈھ سے قبل مدرستہ الاصلاح سرائے میر سے فیضیاب ہو چکے ہیں۔ علوم قرآن اور عربی زبان وادب کے ساتھ ہی انگریزی زبان، جدید سائنس اور تعلیم وتربیت کے جدید وقدیم نظریات پر ان کی گہری نظر ہے۔ نئی نسل کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں اپنے علم ومطالعہ اور تجربات کی روشنی میں انھوں نے ایک مستقل فلسفۂ تعلیم کی تشکیل کی ہے۔ اللہ کرے کہ اس کے نفاذ کی تدابیر عمل میں لائی جا سکیں۔

یہ بھی عرض کردوں کہ مدرستہ الاصلاح میں تعلیم حاصل کرنے کے زمانہ میں حدیث کے سلسلہ میں وہ مولانا فراہی کے مکتبِ فکر سے بھی متاثر ہوئے۔ ان کی سابقہ تصنیفات میں اس کے اثرات ملتے ہیں لیکن اس تصنیف پر نظر ثانی کرتے ہوئے موصوف نے اپنی علمی زندگی کے چند ایام کے لیے میرے غریب خانہ کو مشرف فرمایا اور مجھ بے علم پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی اس بہترین کتاب سے مستفید ہونے کا مجھے بھی موقع دیا اور میں نے حرفاً حرفاً کتاب کو پڑھا اور جو کچھ میری سمجھ میں آیا میں نے بے تکلف عرض بھی کر دیا۔ انھوں نے میرے چھوٹے سے ذاتی کتب خانہ میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ وغیرہم کی اہم مؤلفات کا مطالعہ کیا اور کتاب کے مسودہ میں تبدیلی بھی کی۔ میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں حدیث کے استناد کی بابت ان کے یہاں کچھ شبہات تھے جو تصویر کا دوسرا اور صحیح رُخ سامنے آنے کے بعد بحمداللہ دور ہو گئے۔

موصوف کی یہ کتاب بہت سے لوگوں کو چونکائے گی، کافی لوگوں کی انشاء اللہ اس سے اصلاح بھی ہو گی۔ مختلف اہم شخصیات کے خیالات کا موصوف نے دلائل کی روشنی میں بھرپور تجزیہ کیا ہے، اور توحید کی حقیقت پورے طور پر نکھارنے کی کوشش کی ہے، اور میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ وہ اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ ہم موصوف کے شکرگذار ہیں کہ انھوں نے ہمیں اس کتاب کی اشاعت کا شرف بخشا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو لوگوں کے عقیدہ وعمل کی اصلاح کا ذریعہ اور مصنف وناشر سب کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین!

١١ر رمضان المبارک ١٤١١ھ

عبدالحمید رحمانی
صدر: ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سنٹر، ١/٨، جوگابائی نئی دہلی

دیباچہ

اسلام میں توحید کو جو اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہے اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس کا مفہوم کسی بھی اختلاف و نزاع سے بالاتر ہوتا لیکن اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ دین کی یہ بنیادی حقیقت بھی بحث و اختلاف سے محفوظ نہ رہ سکی۔

اس موضوع پر اب تک جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں افراط و تفریط کا پہلو غالب ہے۔ کسی میں بحث و گفتگو صرف اللہ کی ذات و صفات تک محدود ہے اور اس کی "حاکمیت" کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور کسی میں اللہ کی حاکمیت کی اہمیت کو اتنا زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے کہ ذات و صفات کا تصوّر دھندلا پڑ گیا ہے اور بعض کتابوں میں صرف ذات یعنی "وجود" کو اصل توحید کی حیثیت سے فلسفیانہ رنگ و آہنگ میں پیش کیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں صفات اور حاکمیت دونوں کی وحدت متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔

زیرِ نظر کتاب میں پوری کوشش کی گئی ہے کہ توحید کے قرآنی تصوّر کو کسی افراط و تفریط کے بغیر پیش کیا جائے اور اس کے جملہ پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالی جائے کہ اس سلسلہ میں کسی غلط اندیشی کے لیے کوئی معقول گنجائش باقی نہ رہے۔

اس مقصد کے پیشِ نظر سب سے پہلے ایک مقدمہ تحریر کیا گیا ہے جس میں توحید کے دو مقابل مکاتبِ فکر کا اختصار کے ساتھ تنقیدی جائزہ لے کر قرآن مجید کے تصوّرِ توحید سے ان کی عدم مطابقت دکھائی گئی ہے تاکہ اگلے صفحات میں توحید کا جو قرآنی تصوّر پیش کیا گیا ہے اس کے فہم میں کوئی غیر قرآنی یا ناقص تصوّرِ توحید

خارج نہ ہو۔

مقدمہ کے بعد ہم نے توحید کے لغوی معنی اور اس کی مختلف اقسام کی وضاحت کی ہے اور اس باب میں پائے جانے والے متعدد غلط خیالات کی اصلاح کی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ توحید کا قرآنی تصوّر اس وقت تک صحیح طور پر واضح نہیں ہو سکتا جب تک کہ قرآن مجید کی دو اہم بنیادی اصطلاحات یعنی "الٰہ و رب" کے مفہومات کو ٹھیک طور پر متعیّن نہ کر لیا جائے۔ توحید سے متعلق علماء میں جس قدر اختلافات ملتے ہیں ان کا ایک بڑا سبب ان اصطلاحات کے فہم میں فرق و اختلاف ہے۔ ہر عالم دین نے اپنے اپنے میلانِ طبع اور ذوقِ مذہبی کے مطابق ان کی تشریح کی ہے اور قرآن مجید سے بطور استشہاد صرف انہی آیات کو لیا ہے۔ جو اس کے خیال کی بظاہر مؤیّد نظر آئیں۔ بعض علماء نے سرے سے قرآن مجید کو نظر انداز کر کے صرف ان کے لغوی معانی پر اپنا قصرِ تخیّل تعمیر کیا ہے۔

ہم نے اس طرزِ فکر سے حتی الامکان گریز کرتے ہوئے قرآن مجید کے نظائر اور عربی کی مستند کتب لغات کی روشنی میں الٰہ و رب کے لغوی اور اصطلاحی مفہومات کو متعیّن کر کے قرآن حکیم کے تصوّرِ الوہیت و ربوبیت کی تشریح کی ہے اور ساتھ ہی اس سلسلے میں علماء کے اختلافات کی اصل حقیقت اور اس باب میں ان کی فکری لغزشوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہم نے اُمم سابقہ کے تصوّراتِ الوہیت و ربوبیت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے تاکہ اس سلسلہ میں ان سے جو فکری اور عملی لغزشیں سرزد ہو چکی ہیں وہ معلوم ہو جائیں اور قرآن مجید نے جس طور پر ان کی اصلاح کی ہے اس کی نوعیت و اہمیت بھی واضح ہو جائے۔

اسی ضمن میں ہم نے محبّتِ الٰہی کے مسئلہ کو بھی لیا ہے۔ عام طور پر مذہبی لوگوں میں محبّت الٰہی کا جو تصوّر پایا جاتا ہے وہ بڑی حد تک سطحی ہے۔ چنانچہ اس کی ظاہری صورت یعنی قولی محبّت پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ اس کی اصل حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور اس باب میں قرآن مجید نے جو فیصلہ کن بات کہی ہے اس کو بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے یعنی عملی محبت جو اتباعِ رسول کا دوسرا نام

ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو محبّت قول سے گذر کر عمل تک نہ پہنچے وہ محض فریبِ نفس ہے۔

الٰہ و رب کے قرآنی تصورات کی وضاحت کے بعد ہم نے ایک اہم سوال کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ یہ کہ اگر توحید جیسا کہ قرآن مجید کا بیان ہے' (اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی (الأعراف: ۱۷۲) انسانی فطرت کا جزء ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ انسانوں کی کثیر تعداد ہر دور میں شرک میں مبتلا ہوئی اور آج بھی مبتلا ہے۔ شرک کی کثرت اور اس کے تسلسل کو دیکھ کر عام لوگوں کے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ توحید انسانی فطرت کا جزء لاینفک ہے۔ ہم نے اس پیچیدہ سوال کا اپنے علم کی حد تک اطمینان بخش جواب دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی توحید الٰہ کے عقلی و نقلی دلائل بھی پیش کیے ہیں تاکہ تعدّد الٰہ کے مشرکانہ تصوّر کا ابطلان ہوسکے۔

عملی طور پر توحید کے بیان میں سب سے زیادہ اہمیت جس چیز کو حاصل ہے وہ اس کے تقاضے ہیں جن میں تکوینی اور تشریعی دونوں طرح کے تقاضے شامل ہیں۔ لیکن عام طور پر تکوینی تقاضے تو بیان کیے جاتے ہیں لیکن تشریعی تقاضے نظرانداز کر دیے جاتے ہیں گویا اللہ تعالیٰ آسمانوں کا رب تو ہے لیکن زمین کا رب نہیں' اور اگر ہے تو صرف تکوینی حد تک۔ ہم نے اس مہلک غلط فہمی کو رفع کیا ہے اور توحید کے تکوینی تقاضوں کے ساتھ اس کے تشریعی تقاضوں کو بھی بیان کیا ہے اور اس میں تفریق کے رجحان کی تردید کی ہے۔

تکوینی تقاضوں میں سب سے اہم تقاضا توکل علی اللہ ہے، لیکن علماء بالخصوص صوفیہ نے اس کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ ہمارے نزدیک بڑی حد تک غیر قرآنی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں حد درجہ غلو پایا جاتا ہے۔ ہم نے قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں نہ صرف اس کے حقیقی مفہوم کو پیش کیا ہے بلکہ اس کے غیر قرآنی تصوّر کی غلطی بھی واضح کر دی ہے۔

توحید کے چشمۂ صافی کو جن غیر اسلامی خیالات کی کثافت نے گدلا کر رکھا ہے ان میں سے ایک "وسیلہ" بھی ہے۔ آج مسلمانوں میں اولیاء پرستی کی جو گرم بازاری نظر آتی ہے اس کی ایک بڑی وجہ وسیلہ کا غلط تصوّر ہے۔ ہم نے عربی لغت، تفاسیر اور احادیث کی روشنی میں وسیلہ کے صحیح مفہوم کو پیش کیا ہے اور اس سلسلہ میں پائی جانے والی متعدّد غلط اندیشیوں کا ازالہ کیا ہے۔

اخیر میں ہم نے "اقامت توحید" کے عنوان سے اس کی دعوتی حیثیت اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دینی جماعتیں اپنی ساری توجہ یا تو فروعی باتوں پر صرف کرتی ہیں یا محض احکامِ عبادات کے بیان پر، حالانکہ اگر توحید کا صحیح تصوّر دل و دماغ میں راسخ نہیں ہے تو صرف احکام عبادات پر عمل سے کوئی دنیوی یا اُخروی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ کیا یہ ایک اندوہناک حقیقت نہیں ہے کہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم صلاۃ، صوم اور دیگر عبادات پر عمل کے باوجود شرک میں مبتلا ہے۔ اللہ کے علاوہ دوسروں کو بھی حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جاتا ہے اور اس خیال کے تحت بزرگان دین کے مزارات پر حاضری دی جاتی ہے اور حد یہ ہے کہ وہاں سجدے تک کیے جاتے ہیں۔ عبادات کے ساتھ ان غیر توحیدی افعال کے اجتماع کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ان کے اذہان توحید کے قرآنی تصوّر سے ناآشنا ہیں۔ یہ ناآشنائی اس حد تک ہے کہ کھلے ہوئے افعال شرک کے ارتکاب کے باوجود یہی سمجھتے ہیں کہ وہ توحید سے منحرف نہیں ہوئے ہیں۔

اس ایمان سوز صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ دینی جماعتیں اپنی ساری سعی اقامتِ توحید میں صرف کریں اور توحید کے صحیح قرآنی تصوّر سے مسلمانوں کو آگاہ کریں۔ یقین کیجیے، جب تک مسلمان قرآن مجید کی توحیدی تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہوں گے ذلّت و غلامی کی موجودہ حالت سے نکلنا ان کے لیے ممکن نہ ہوگا۔

راقم محترم مولانا عبدالحمید رحمانی صاحب کا بے حد ممنون ہے کہ انھوں نے نہ صرف مسودہ دیکھنے کی زحمت گوارا کی بلکہ اس کی طباعت کی ذمہ داری بھی

قبول کرلی ۔ فجزاہ اللہ خیرالجزاء ۔

اللہ سے دعا ہے کہ ہماری یہ حقیر سعی توحید کے قرآنی تصوّر کی تفہیم میں معین ومددگار ثابت ہو اور مسلمان شرک سے مکمل طور پر دامن کش ہو کر توحید کی راہ میں من حیث الجماعت گام زن ہوں تاکہ دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب وبامراد ہوں ۔

الطاف احمد اعظمی
۲۰ر جنوری ۸۹ء
نئی دہلی

مقدمہ

"لا الٰہ الا اللہ" ایک ایسا مہتم بالشّان توحیدی کلمہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو نبی درسول بھی کسی دور میں مبعوث ہوا اس نے اپنی دعوت کا آغاز اسی کلمہ سے کیا اور زندگی کی آخری سانس تک اسی کی طرف انسانوں کو بلاتا رہا، امام ابن ابی العز شرح طحاویہ میں لکھتے ہیں[1]:

ھذہ کلمۃ التوحید التی دعت إلیھا الرسل کلّھم

یہ (لاالٰہ) توحیدی کلمہ ہے جس کی طرف تمام رسولوں نے دعوت دی ہے

دوسری جگہ فرماتے ہیں[2]:

اعلم أن التوحید اول دعوۃ الرسل واوّل منازل الطریق واوّل مقام یقوم فیہ السالك ای اللہ عزوجل قال: لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ۔

جان لو کہ رسولوں کی اوّلین دعوت توحید تھی۔ اس راہ کی یہ پہلی منزل ہے اور پہلا مقام بھی جس سے سالک اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا،

---

[1] امام ابن ابی العزّ حنفی شرح العقیدۃ الطحاویۃ، الطبع الرابع ۱۳۹۱ھ بیروت ص ۱۱۱

[2] ایضاً ص ۷۶

اس نے کہا : اے میری قوم کے لوگو ! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی اور الٰہ (معبود) نہیں ہے۔

دین میں توحید کے اس مقام و مرتبہ سے کسی بھی مکتبِ فکر کے عالم کو اختلاف نہیں ہے۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہی دین کا مغز و جوہر ہے اس کو نکال دینے کے بعد دین باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس کے حقیقی مفہوم کے تعین میں ان میں اختلاف ہے۔ علماء ظاہر کے نزدیک اس کا مطلب اللہ کی ذات وصفات اور اس کے حقوق کی تفرید ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات کے اعتبار سے واحد و یکتا ہے کوئی اس کے ساتھ کسی درجہ میں بھی شرکت نہیں رکھتا اور وہی خالق اور معبودِ حقیقی ہے۔

اس تشریح کے مطابق "رب" کے معنی صرف خالق اور پروردگار کے اور "الٰہ" کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کے سامنے مراسمِ پرستش بجالائے جائیں، اس میں حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ کا مفہوم شامل نہیں ہے۔[1] شارح طحاویہ نے توحید کی قسمیں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے[2]:

والثاني : توحيد الربوبية وبيان أن الله وحده خالق كل شئ، والثالث : توحيد الالهية، وهو استحقاقه سبحانه وتعالى أن يعبد وحده لاشريك له۔

"دوسری قسم توحید ربوبیت ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا خالق ہے، اور تیسری قسم توحید الوہیت ہے یعنی اللہ وحدہ لاشریک ہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔"

---

[1] معدودے چند علماء نے حقوق اللہ میں اقتدارِ اعلیٰ کو بھی شامل کیا ہے۔

[2] شرح العقيدة الطحاوية ص ۷۶

جہاں تک ارباب باطن یعنی صوفیہ کا تعلق ہے انھوں نے توحید کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ علماء ظاہر کے بیان کردہ مفہوم سے بالکل مختلف ہے[1]۔ حضرت حصری کے نزدیک توحید کا مفہوم یہ ہے[2]:

اصولنا فی التوحید خمسة اشیاء: رفع الحدث، اثبات القدم، وهجر الاوطان، مفارقة الاخوان و نسیان ما علم وجهل۔

"توحید میں ہمارے نزدیک پانچ چیزیں بنیادی ہیں: رفع الحدث[3]، اثبات[4] قدم، ترک[5] وطن، مفارقت[6] اخوان اور معلوم و نامعلوم سب کو بھول جانا"

---

[1] صوفیہ کہتے ہیں کہ علماء ظاہر توحید کی عقلی تفہیم سے قاصر رہے۔ حضرت علی ہجویری فرماتے ہیں:

حق تعالیٰ یکیست بی قسم اندر ذات وصفات خود وبی بدیل وشریک اندر افعال خود، وموحّدان وی را بدیں صفت دانستہ اند و دانش ایشاں را بیگانگی توحید خوانند (کشف المحجوب ص ۲۴۵)

"حق تعالیٰ واحد و یکتا، باعتبار ذات وصفات ناقابل تقسیم اور اپنے افعال میں بے بدیل و شریک ہے۔ اور موحّدین اس کو انھی صفات سے متصف جانتے ہیں اور اپنی عقل کو توحید کے فہم سے قاصر بتاتے ہیں" (اس کے بعد انھوں نے توحید ذات کی عقلی تشریح کی ہے)

[2] ابوالحسن علی بن عثمان جلابی ہجویری، کشف المحجوب، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد، اسلامک فاؤنڈیشن لاہور ۱۹۷۸ میلادی ص ۲۴۷۔

[3] ماسوا اللہ کی نفی۔

[4] قدیم یعنی اللہ تعالیٰ کا اثبات۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت جنید بغدادی (متوفی ۲۹۷/ ۹۱۰ء) فرماتے ہیں[1]:

التوحید افرادا لِقدم عن الحادث

"توحید قدیم کو حادث سے الگ کرنا ہے"۔

شیخ علی ہجویری (متوفی ۴۶۵/ ۱۰۷۳ء) نے اس کی وضاحت اس طور پر کی ہے[2]:

توحید جدا داشتن قدم بود از حادث یعنی آں کہ قدیم را محل حوادث ندانی و حوادث را محل قدیم ندانی و معلوم گردانی کہ حق تعالیٰ قدیم است و تو ضرورۃ محدثی، از جنس تو ہیچ چیز بدو نپیوندد و از صفات وی ہیچ چیز اندر تو نیا میزد کہ قدیم را با محدث مجانست نہ بود، از آنچہ قدیم پیش از وجود حوادث بود، چوں قبل وجود الحوادث قدیم بود و بمحدث محتاج نہ بود بعد وجود الحوادث بدو نیز محتاج نگردد۔

"توحید کا مطلب ہے قدیم کو حادث سے الگ کرنا یعنی یہ کہ تو قدیم کو حوادث کا اور حوادث کو قدیم کا محل نہ جانے اور تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ

(حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ)

۵ یہاں ترک وطن سے خواہشات نفس سے دست بردار ہونا مراد ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ سب سے اچھی ہجرت کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا: "أن تهجر ما كره ربك" یعنی سب سے عمدہ ہجرت یہ ہے کہ جو چیزیں اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں تم ان کو چھوڑ دو (نسائی ک ۳۹ ب ۱۲ ج ۷ ص ۱۴۴ رقم ۴۱۶۵ مسند احمد ج ۲ ص ۱۶۰، ۱۹۱، ۱۹۳ و ج ۴ ص ۳۸۵)

۶ مفارقت اخوان سے مراد اللہ تعالیٰ سے غافل لوگوں سے ترک تعلق ہے۔

۱ کشف المحجوب ص ۲۴۷

۲ ایضاً ص ۲۴۷

حق تعالیٰ قدیم اور تو ضرورۃً محدث (مخلوق) ہے۔ تمھاری جنس کی ایک چیز بھی اس سے کسی قسم کا رشتہ نہیں رکھتی اور اس کی صفات میں سے کوئی چیز بھی تمھارے اندر موجود نہیں ہے کہ قدیم اور محدث میں مجانست نہیں اس بنا پر کہ قدیم حوادث کے وجود میں آنے سے پہلے موجود تھا۔ چونکہ قدیم حوادث کے وجود سے پہلے موجود تھا اور محدث کا محتاج نہ تھا اس لیے حوادث کے وجود میں آنے کے بعد بھی ان کا محتاج نہ ہوگا۔"

امام غزالی (متوفی ۵۰۵/ ۱۱۱۱ء) نے درجات توحید بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:[۱]

"توحید کے چار[۲] درجے ہیں، پہلا درجہ ایمان باللسان ہے، یہ منافقوں کا ایمان ہے۔ دوسرا درجہ کلمہ کے معنی کی تصدیق ہے (تصدیق بالقلب) یہ عام مسلمانوں کا ایمان ہے۔ تیسرا درجہ بطریق کشف اس کا مشاہدہ کرنا ہے، یہ مقام مقربین کا ہے۔ یہ اس طرح کہ اسباب کثیرہ کو دیکھتے ہوئے جانے کہ سب واحد قہار سے ہیں۔ چوتھا درجہ یہ ہے کہ سوائے اللہ کے کسی کو نہ دیکھے، یہ صدیقین کا مشاہدہ ہے جسے صوفیہ فنا فی التوحید کہتے ہیں۔"

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ صوفیہ نے توحید کا جو تصور دیا ہے اس کا ایک بڑا حصہ فلسفیانہ ہے مثلاً قدیم اور حادث کی بحث اور وجود حق کا مشاہدہ اور اس کے ماسوا کی نفی جسے اصطلاح تصوف میں وحدۃ الوجود[۲] کہا جاتا ہے، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے صوفیہ "وجود" کے فلسفیانہ نظریے کی توضیح میں جس کا

۱؎ المرشد الامین، خلاصہ احیاء العلوم (امام غزالی) مطبوعہ نئی دہلی ۱۹۸۸ء ص ۲۴۳۔

۲؎ وحدۃ الوجود پر تفصیلی بحث ہم نے اپنی کتاب "وحدۃ الوجود ایک غیر اسلامی نظریہ" میں کی ہے۔ قارئین اسے ملاحظہ فرمائیں۔

اسلام کی تعلیمات سے دور کا بھی تعلق نہ تھا، حد سے تجاوز کر گئے اور اس باب میں ان سے نادانستہ طور پر قرآنی ہدایت کی کھلی خلاف ورزی صادر ہوئی۔

قرآن مجید کے نزول کی غرض یہ قطعاً نہ تھی کہ وہ مسئلۂ وجود کی پیچیدہ گتھی کو سلجھائے بلکہ واضح طور پر اس کی غایتِ نزول یہ تھی کہ انسان اپنے مقصدِ تخلیق سے آگاہ ہو اور وہ مقصد یہ ہے: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ" (ذاریات: ۵٦) "ہم نے جن اور انسان کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے" یہاں عبادت کو وسیع تر معنی میں لینا ہوگا یعنی انسان کا مقصدِ تخلیق یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی اور خوشی سے صرف اللہ وحدہ لاشریک کو اپنا خالق و مالک اور معبود حقیقی قرار دے، اسی کے آگے سرِ نیاز جھکائے، اسی سے مدد چاہے، اسی سے فریاد طلبی کرے، اسی پر اعتماد و توکّل کرے اور اسی کے احکام و ہدایات کے مطابق زندگی گذارے۔ اسی کو اصطلاحاً توحید کہتے ہیں۔ مجدّد الف ثانی (متوفی ۱۰۳۴ھ/ ۱٦۲۵ء) نے ایک موحّد کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے[1]:

> از مرضی بمغضوب التفات نمی نمایند، و بلقمہائے چرب و شیریں خود را نمی فروشند، بجامہائے رقیق و مزیّب خط بندگی نمی دہند، عار دارند از آنکہ تخت شاہی بقاذورات تعلقات ملوث دارند، و ننگ دارند از آنکہ در ملک خداوندی جل سلطانہ لات و عزیٰ را شرکت دہند، اے برادر اینجا ہم دینِ خالص راطلبند: ألا للہ الدین الخالص۔

> "کامل توحید کے حامل لوگ پسندیدہ امور کو چھوڑ کر مغضوب اُمور کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اپنے آپ کو چرب و شیریں لقموں کے عوض نہیں بیچتے اور باریک و خوشنما کپڑوں کے لیے غلامی اختیار نہیں کرتے۔ وہ اس بات سے عار رکھتے ہیں کہ تخت شاہی کو تعلقات کی نجاست سے آلودہ رکھیں اور اس بات سے بھی

---

[1] مجدّد الف ثانی، مکتوبات، دفتر اوّل مکتوب نمبر ۱۷۴ (مطبوعہ حیدر آباد دکن)

ننگ رکھتے ہیں کہ اللہ کی بادشاہی میں لات وعزّیٰ (ماسوا اللہ) کو شریک کریں۔
اے بھائی، اللہ کی بارگاہ میں وہ فقط دین خالص کو طلب کرتے ہیں، خبردار خالص
اطاعت وبندگی کا مستحق صرف اللہ ہے۔"

اسلام کی سادہ توحیدی تعلیم کو اس کے مخالفین ومعاندین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ مشہور مغربی فاضل جان ولیم ڈریپر لکھتا ہے[1]:

His Theology was simple "There is But one God.... Asserting That Everlasting truth, He did not Engage in vain Metaphysics.

"ان (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذہب بالکل سادہ تھا یعنی ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں . . . . . اس دائمی صداقت کے اعلان میں انھوں نے مابعد الطبیعیاتی فلسفہ سے ذرا بھی تعرّض نہ کیا۔"

مشہور برطانوی فلسفی برٹرینڈ رسل نے بھی اعتراف کیا ہے[2]:

The Religion of the Prophet was a simple Monotheism, uncomplicated by the Elaborate Theology of the Trinity and Incarnation.

"پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذہب بالکل سادہ توحید پر مبنی تھا۔ اس میں عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث اور تجسّم کی پیچیدگیاں نہ تھیں۔"

مغربی فضلاء کا مذکورہ اعتراف بالکل سچائی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید نے توحید کی جو تعلیم دی ہے وہ نہایت سادہ اور عالم وجاہل سب کے لیے بقدر استعداد قابل فہم اور قابل اتّباع ہے۔ اس میں نہ کوئی فلسفیانہ بحث و نزاع ہے اور نہ منطقی طرز استدلال کی پیچیدگی، جیسا کہ اگلے صفحات سے بخوبی معلوم ہو جائے گا۔

---

[1] جان ولیم ڈریپر، ہسٹری آف دی انٹلکچول ڈیویلپمنٹ آف یورپ، لندن ۱۸۶۴ء ج ا ص ۳۱۹

[2] برٹرینڈ رسل، ہسٹری آف ویسٹرن فلاسفی، لندن ۱۹۵۷ء ص ۴۴۱

توحید کے معنی

توحید کا مادہ "و، ح، د" ہے، لغت میں اس کے معنی ہیں، یہ جاننا کہ فلاں شے ایک ہے[1] اور شرعاً توحید کا مفہوم ہے ایک معبود کی عبادت کرنا اور ذات و صفات اور افعال میں اس کی وحدانیت کا اعتقاد رکھنا۔

توحید کی قسمیں

توحید کی تین قسمیں ھیں :

(۱) توحید ذات وصفات
(۲) توحید الوہیت
(۳) توحید ربوبیت

توحید ذات

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر دور میں انسان کی کثیر تعداد نے خالق کائنات کو بالکل ایک انسان جیسی صفات رکھنے والی ہستی سمجھا اور اس خیال کے مطابق انھوں نے اس کے لیے بیوی اور بچّے تجویز کیے اور اس طرح معبودوں کی ایک پوری فوج تیار ہوگئی۔ قدیم یونان میں ان معبودوں کی تعداد بے شمار تھی، بابل،

---

[1] شیخ ہجویری نے لکھا ہے: توحید حکم کردن بریگانگی چیزے "توحید کسی چیز کو واحد قرار دینا ہے" (کشف المحجوب ص ۲۴۵)

مصر اور ہندوستان کا بھی یہی حال تھا جہاں دیوی دیوتاؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ہندوستان میں آج بھی یہ صورت برقرار ہے۔ عربوں کا بھی یہی تخیّل تھا، وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور ان کا نام انھوں نے عورتوں جیسا رکھ چھوڑا تھا (سورۂ نجم : ۲۸) جنوں کے بارے میں بھی وہ اسی قسم کا خیال رکھتے تھے (الصّٰفّٰت : ۱۵۸) نصاریٰ بھی اسی غلط راہ پر چلے اور انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا اور آج تک علوم و فنون میں تمام تر ترقی کے باوجود ان کی ایک بڑی تعداد اس خیال باطل کی قائل ہے۔ ان میں جو اہل علم ہیں وہ "ابنیت" کی تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ آدمی تو تھے لیکن اپنے اندر الٰہی اوصاف رکھتے تھے۔ (نعوذ باللہ)

اللہ کی ذات کے سلسلہ میں اقوام ماضیہ کے ان مشرکانہ تخیّلات کی وجہ سے قرآن مجید نے تعدّد ذات (Polytheism) کے تصوّر کی شدت سے تردید کی اور واضح لفظوں میں بتایا کہ اللہ جو خالق کائنات ہے، اپنی ذات میں واحد و یکتا ہے، اس کو نہ کسی نے جنا ہے اور نہ خود اس نے کسی کو جنا ہے، وہ حسب و نسب سے بالکلیہ منزّہ ہے، اس کا نہ کوئی اوّل ہے اور نہ آخر، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ سورۂ اخلاص میں جو قرآن مجید کی ایک بے نظیر سورہ ہے، توحید ذات کے تصوّر کو نہایت ایجاز کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، فرمایا :

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ○ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○

کہہ دو، اللہ ایک ہے، وہ بے نیاز ہے اور سب اس کے حاجت مند ہیں، نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔

ایک دوسرے مقام پر جنوں کی زبان سے اس حقیقت کبریٰ کا اعلان اس طرح ہوا ہے :

وَاَنَّهٗ تَعَالٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا○ وَاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا○ وَاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا○

(سورۂ جن : ۳ تا ۵)

اور ہمارے پروردگار کی شان بہت بڑی ہے، اس نے نہ کسی کو بیوی بنایا ہے اور نہ اولاد، اور ہم میں جو احمق ہوئے ہیں وہ اللہ کی شان میں حد سے بڑھی ہوئی باتیں کرتے تھے اور ہمارا (پہلے) یہ خیال تھا کہ انسان اور جنات اللہ کے بارے میں کبھی جھوٹ بات نہ کہیں گے۔

توحید صفات

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں واحد و یکتا ہے اسی طرح اپنی صفات میں بھی یکتا و بے مثل ہے۔ توحید صفات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے خود کو (وحی جلی یا وحی خفی کے ذریعہ) جن صفات سے متّصف کیا ہے ان میں کسی مخلوق کو اصلاً شریک نہ کیا جائے مثلاً اللہ کی ایک صفت "عالم الغیب والشہادۃ" ہے یعنی وہ ہر حال میں کائنات کے ہر ظاہر و پوشیدہ کو بخوبی جانتا ہے، کسی مخلوق کے بارے میں یہ خیال رکھنا کہ وہ بھی اسی طرح عالم غیب و شہادت ہے، توحید صفات کے منافی ہے۔ اسی طرح اس کی ایک صفت "سمیع الدعاء" ہے۔ دنیا کے کسی ملک و علاقہ کا کوئی انسان کسی حال میں، کسی وقت اور کسی جگہ اعلان کے ساتھ یا پوشیدگی میں اللہ کو پکارے یعنی دعا کرے تو وہ اس کی دعا کو فوراً سُن لیتا ہے یعنی اس کی سماعت کی راہ میں زمان و مکاں کے فاصلے حائل نہیں ہوتے لیکن کسی اور کے بارے میں یہی عقیدہ رکھنا شرک فی الصفات قرار پائے گا۔ یہی معاملہ اللہ کی دوسری صفات کے ساتھ بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بعض صفتیں وہ ہیں جو انسانی صفات سے لفظی اشتراک رکھتی

ہیں مثلاً صفتِ علم کو لے لیجیے ، فرمایا ہے : وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (الانعام: ۱۰۱) "وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے" اور انسان کے بارے میں بھی کہا گیا ہے : وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ (الذاریات : ۲۸) "اور انھوں نے اسے ایک علیم بیٹے کی بشارت دی"۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اللہ کا علم اور اسحاق علیہ السلام کا علم یکساں معنیٰ و مفہوم رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت رءوف و رحیم ہے : إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (توبہ : ۱۱۷) "وہ ان پر حد درجہ شفیق و مہربان ہے"۔ انسان کو بھی اسی صفت سے متصف کیا گیا ہے : لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (توبہ : ۱۲۸) "لوگو! تمھارے پاس خود تم میں سے ایک ایسا رسول آگیا ہے جس کو تمھاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے، جو تمھاری بھلائی کا دل سے خواستگار ہے اور مومنوں پر تو حد درجہ شفیق و مہربان ہے"۔ لیکن کھلی بات ہے کہ اللہ کی رحمت کا وہ مفہوم نہیں جو مخلوق کی رحمت سے عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اسی فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سے ارباب علم دنیا کے حوادث و آفات کی حقیقت کے سمجھنے سے قاصر رہے۔

اسی طرح اللہ کی دو اہم صفات سمیع و بصیر ہیں : إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا (نساء : ۵۸) "بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے"۔ اور مخلوق کے حق میں بھی ارشاد ہوا ہے : إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا (دھر : ۲) "ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے بنایا تاکہ اس کا امتحان لیں اس غرض سے ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا"۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی سماعت و بصارت اور انسان کی سماعت و بصارت میں باعتبار حقیقت بُعد المشرقین ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہوگیا کہ خالق اور مخلوق کی جن صفات میں لفظی

مماثلت پائی جاتی ہے وہ باعتبار معنی و اطلاق بالکل غیر مماثل ہیں۔ انسانی صفات کی حیثیت اعراض کی ہے جب کہ خالق کی صفات بالذّات ہیں، دوسرے لفظوں میں قائم بالذّات، غیر فانی اور غیر محدود ہیں اور مخلوق کی صفات جو جوارح کے ساتھ قائم ہیں، عارضی، محدود اور فانی ہیں۔ اس لیے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ خالق کی صفات کو مخلوق کی صفات پر قیاس کیا جائے۔[1] یہ توحید صفات کے سراسر منافی ہے، صاحب تفسیر المنار لکھتے ہیں[2]:

---

[1] اس باب میں قرآن مجید کی یہ آیت بہت اہم ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (شوریٰ: ۱۱) "اس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے" آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سمیع و بصیر تو ہے لیکن ہم اس کی سماعت و بصارت کی تشبیہ کسی چیز سے نہیں دے سکتے کیوں کہ اس دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس کی مثل و نظیر ہو۔ آیت کا پہلا جزء نفی تمثیل و تشبیہ (توحید صفات) پر اور آخری جزء (وھو السمیع البصیر) بلا تشبیہ اثبات صفات پر دلالت کرتا ہے۔

صفات باری تعالیٰ کے باب میں ماضی میں مسلمانوں میں متعدد فرقے موجود تھے مثلاً جہمیہ، اشاعرہ اور معتزلہ۔ جہمیہ تعطیل کے، اشاعرہ اثباتِ صفات کے ساتھ تاویل و تحریف کے اور معتزلہ نفی صفات کے قائل تھے۔ معتزلہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اثباتِ صفات کے معنی تشبیہ و تمثیل کے ہیں اور یہ منافی توحید ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صفات باری تعالیٰ کے بارے میں ان فرقوں کا نقطۂ نظر افراط و تفریط کا مظہر ہے اور حق سے بہت دور ہے۔ اس بارے میں صحیح نقطۂ نظر بلا تشبیہ اثبات صفات ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود کو جن صفات عالیہ (اسمائے حسنیٰ) سے متصف کیا ہے ان پر کسی تمثیل، تکییف اور تعطیل کے بغیر ایمان رکھا جائے۔ اس سلسلے میں قارئین جو عربی داں ہیں، درج ذیل کتابوں کا مطالعہ فرمائیں:

(۱) کتاب التوحید و اثبات صفات الرب عزوجل، مؤلفہ امام محمد بن اسحٰق خزیمہ۔

(۲) کتاب الاسماء والصفات، امام بیہقی۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ان لـه رحمة ليست كرحمة المخلوق، و غضباً لا يشبه غضب المخلوق، واستواء على عرشه ليس كاستواء الملوك المخلوقين على عروشهم لأنه تعالى علمنا بما بيّن لنا من أسمائه وصفاته وأفعاله كل ما أوجب علينا أن نعلمه من عظمته وكماله و جلاله وجماله وافعاله و لا يمكن بيان ذلك إلا بالألفاظ التى نستعلمها فى شئون انفسنا وعلّمنا مع ذلك أنه ليس كمثله شئ فعصمنا بهذا التنزيه أن يضلنا الاشتراك اللفظى فنقع فى التشبيه

"وہ رحیم ہے لیکن اس کی رحمت مخلوق کی طرح نہیں، وہ غضب کی صفت بھی رکھتا ہے مگر مخلوق کی صفت غضب کے مشابہ نہیں، استوار علی العرش بھی اس کے لیے ثابت ہے مگر بادشاہوں کے استوار کے مانند نہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسمار وصفات اور اپنے افعال سب ہم کو بتا دیے ہیں جن سے ہم اس کی عظمت وکمال، اس کے جلال وجمال اور اس کے افعال کا حال معلوم کر سکیں، اور ان کا بیان انہی الفاظ کے ذریعہ ہو سکتا ہے جو ہم اپنے بارے میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتادیا کہ اس

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

(۳) العقیدۃ الواسطیہ، شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ

(۴) الفتوی الحمویۃ الکبریٰ، " "

(۵) النصیحۃ فی صفات الرب جلّ وعلا، علامہ شیخ احمد بن ابراہیم واسطی شافعی صوفی۔

(۶) القواعد المثلیٰ فی صفات اللہ واسمائہ الحسنیٰ، شیخ محمد بن صالح عثیمین۔

ے۲ رشید رضا مصری، تفسیر المنار ج ۹ ص ۴۴۷۔

کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔ اس تنزیہہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے بچالیا کہ لفظی اشتراک سے دھوکا کھاکر تشبیہ کے قائل ہوجائیں؟

اس سلسلے میں امام ابن خزیمہ اپنی کتاب "کتاب التوحید" میں فرماتے ہیں[1]:

لا يغيب عن بصره من ذلك شئ يرى مافى جوف البحار و لججها كما يرى عرشه الذى هو مستو عليه وبنو ادم و إن كانت لهم عيون ينظرون بها فانهم إنما يرون ما قرب من أبصارهم مما لا حجاب و ستر بين المرئ و بين أبصارهم مايبعد منهم وإن كان يقع اسم القرب عليه فى بعض الاحوال لأن العرب التى خوطبنا بلغتها قد تقول: قرية كذا منا قريبة، وبلدة كذا قريبة منا و من بلدنا، و منزل فلان قريب منا وإن كان بين البلدين والقريتين و المنزلين فراسخ والبصير من بنى ادم لا يدرك ببصره شخصا اخر من بنى ادم و بينهما فرسخان فاكثر وكذلك لا يرى احد من الآدميين ماتحت الثرىٰ والارض اذاكان فوقها المرئ من الارض والتراب قدر انملة او اقل منها بقدر مايغطى ويوارى الشئ وكذلك لا يدرك بصره إذاكان بينهما حجاب من حائط أو ثوب ضيق أو غيرهما

---

[1] کتاب التوحید، باب البیان من سنن النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی تثبیت السمع والبصر للہ، مطبوعہ مصر، ص ۳۵۔

مما يستتر الشئ عين الناظر۔
اس کی آنکھوں سے کوئی شے پوشیدہ نہیں ہے، وہ سمندر کی گہرائیوں اور اس کی طغیانیوں میں بھی جو کچھ ہے اس کو دیکھتا ہے جیساکہ وہ اپنے عرش کو جس پر وہ متمکن ہے، دیکھتا ہے۔ بنی آدم کے پاس آنکھیں تو ہیں مگر وہ اسی چیز کو دیکھ سکتے ہیں جو ان کی آنکھوں کے قریب ہے اور درمیان میں کوئی حجاب نہیں ہے اور جو دور ہے وہ اس کی آنکھوں سے مخفی ہوتا ہے اگرچہ بعض حالات میں اس پر قرب کا بھی اطلاق ہوتا ہے۔ اس لیے کہ عرب بولتے ہیں:
قرية كذا منا قريبة وبلدة كذا قريبة منا الخ یعنی فلاں بستی یا فلاں شہر ہمارے قریب ہی ہے اور فلاں منزل ہم سے قریب ہی ہے، خواہ ان دو بستیوں اور دو شہروں اور دو جگہوں کے درمیان کئی فرسخ کا فاصلہ ہو۔ بنی آدم میں سے کوئی شخص جس کی آنکھ ٹھیک طور پر کام کرتی ہو، کسی دوسرے شخص کو جو دو یا دو سے زیادہ فرسخ کے فاصلہ پر ہو، دیکھنے پر قادر نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کوئی آدمی تحت الثریٰ میں کیا ہے اس کو کبھی نہیں دیکھتا اور اسی طرح زمین کی ان اشیاء کو نہیں دیکھ پاتا جس پر ایک پور انگل کے برابر یا اس سے بھی کم مٹی پڑی ہو جس سے کہ وہ چیز ڈھک جائے۔ وہ اس وقت بھی دیکھنے پر قادر نہیں ہوتا جب کہ اس کے اور شے مرئی کے درمیان کسی دیوار یا کسی دبیز کپڑے یا ان کے علاوہ کسی اور چیز کا پردہ جو کہ ناظر کی آنکھ کے لیے ساتر بن جائے، حائل ہو۔"

معلوم ہوا کہ اللہ کی ذات کی طرح اس کی صفات میں بھی کسی نوع کی شرکت جائز نہیں ہے۔ لیکن صفات باری تعالیٰ کی حقیقت سے صحیح طور پر واقف نہ ہونے کی وجہ سے اکثر قوموں نے اس معاملے میں غلطیاں کی ہیں حتیٰ کہ مسلمان بھی شرک فی الصفات کی غلطی سے نہ بچ سکے۔ قرآن مجید میں جیساکہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ایک سے زیادہ مقامات پر واضح لفظوں میں کہا گیا ہے کہ علم غیب اللہ کے سوا

کسی کو حاصل نہیں ہے حتیٰ کہ انبیاء و رسل بھی اس صفت سے محروم تھے۔ انھیں امورِ غیب میں سے بس اتنا ہی معلوم تھا جتنا کہ خود اللہ تعالیٰ نے ان کو بتا دیا تھا۔ اس سلسلے میں چند آیات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۝ (نمل: ۶۵)

کہہ دو کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں وہ غیب کا علم نہیں رکھتے بجز اللہ کے۔

(۲) وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ط

(انعام: ۵۹)

اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جسے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

(۳) وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ج (اعراف: ۱۸۸)

اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو بہت سے منافع حاصل کر لیتا اور کبھی کوئی تکلیف مجھ کو نہ پہنچتی۔

آخری آیت میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ کہہ دیں کہ وہ علمِ غیب نہیں رکھتے۔ لیکن اس واضح قرآنی ہدایت کے باوجود آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب سمجھتا ہے[۱]۔ یہ صریح غلو فی الدین ہے اور اس کا شمار شرک فی الصفات میں ہوگا۔

اسی طرح قرآن مجید نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ وفات یافتہ

---

[۱] حیرت ہے کہ بعض جید علماء دین بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں مثلاً مولانا امداد اللہ مہاجر مکی نے لکھا ہے: "لوگ کہتے ہیں کہ علم غیب انبیاء و اولیاء کو حاصل نہیں ہوتا، میں کہتا ہوں کہ اہل حق جس طرف نظر کرتے ہیں ادراک غیبیات کا ان کو ہوتا ہے" (شمائم امدادیہ ص ۹۳)

انسان خواہ وہ کسی قوم کے ہوں اور کتنے ہی بڑے ولی اور بزرگ کیوں نہ رہے ہوں، کسی پکارنے والے کی پکار کو نہیں سُنتے اور اگر کسی ربّانی ذریعہ سے سن بھی لیں تو ان کی حاجت روائی کی ذرا بھی قدرت نہیں رکھتے۔ اس سلسلے میں درج ذیل آیات حجّت قطعی کی حیثیت رکھتی ہیں:

(۱) وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ط وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ط وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۝ (فاطر: ۱۳، ۱۴)

اسے چھوڑ کر جن ہستیوں کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کی بھی مالک نہیں ہیں اگر تم انھیں پکارو تو وہ (بذات خود) تمھاری پکار سن نہیں سکتے اور اگر (کسی ربّانی ذریعہ سے) سن بھی لیں تو تمھاری حاجت روائی نہیں کر سکتے اور روز قیامت وہ تمھارے شرک کا انکار کر دیں گے، ایک خبردار (یعنی اللہ) کے سوا کوئی دوسرا تمھیں اس حقیقت کی خبر نہ دے گا۔

(۲) وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (احقاف: ۵)

اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ایسے کو پکارے۔ جو قیامت تک اس کی حاجت روائی نہ کرے اور ان کو ان کے پکارنے کی بھی خبر نہ ہو۔

(۳) لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ط وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ط (رعد: ۱۴)

اللہ ہی کو پکارنا برحق ہے، جو لوگ اس کے سوا دوسروں کو پکارتے

ہیں وہ ان کی ادنیٰ حاجت بھی پوری نہیں کر سکتے ہیں، انھیں پکارنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی (تشنہ لب) شخص اپنی دونوں ہتھیلیوں کو پانی کی طرف پھیلائے تاکہ پانی اس کے منہ تک پہنچ جائے حالانکہ وہ اس تک پہنچنے والا نہیں۔

اولیاء اور بزرگان دین تو درکنار انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کی وفات کے بعد دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور ان کی اُمّت کس راہ پر چل رہی ہے۔ جیسا کہ سورہ مائدہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ایک جگہ آیا ہے:

وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ ط قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ط إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ط تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَآ أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ط إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ○ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَآ أَمَرْتَنِي بِهِٓ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ج وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ج فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ط وَأَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ○ (مائدہ: ۱۱۶، ۱۱۷)

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی اللہ کے علاوہ دو الٰہ بنا لو۔ عیسیٰ ابن مریم عرض کریں گے کہ تیری ذات۔ اس شرک سے پاک ہے، مجھ کو کسی طرح زیبا نہ تھا کہ میں ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے کہا ہوگا تو تجھ کو اس کا علم ہوگا۔ تو تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتا ہے لیکن تیرے نفس میں جو کچھ ہے میں اس کو بالکل نہیں جانتا، تو ہی تمام غیبوں کا جاننے والا ہے۔ میں نے تو ان سے وہی بات کہی جس کے کہنے کا تو نے مجھ کو حکم دیا تھا کہ تم

اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے۔ اور جب تک
میں ان کے درمیان رہا ان (کے احوال) سے باخبر رہا پھر جب تو نے مجھے
اٹھا لیا تو ہی ان پر نگراں رہا اور تو ہر چیز کی پوری خبر رکھتا ہے۔

جب صورت واقعہ یہ ہے کہ اللہ کا ایک جلیل القدر پیغمبر اپنی وفات کے بعد پیش آمدہ احوال سے قطعاً بے خبر ہے یعنی وہ نہیں جانتا کہ اس کے ماننے والوں نے اس کے بعد کیا طرز عمل اختیار کیا تو کسی اور کے بارے میں یہ خوش گمانی رکھنا کہ وہ اپنی وفات کے بعد اپنے عقیدت مندوں کی پکار کو سنتے اور ان کی حاجات پوری کرتے ہیں سراسر جہل اور کھلا ہوا شرک ہے۔

توحید الوہیت

توحید الوہیت کو توحید عبادت بھی کہتے ہیں۔ تمام ہی انبیاء و رسل نے اپنے مخاطبین کو سب سے اوّل جو تعلیم دی وہ ایک اللہ کی عبادت کی تعلیم تھی، فرمایا گیا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ
اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ○ (انبیآء : ۲۵)

ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے علاوہ کوئی الٰہ نہیں پس میری ہی بندگی کرو۔

قرآن مجید میں جن انبیاء کی دعوتوں کا اجمالی ذکر آیا ہے ان سے یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو دعوتِ حق دی تھی وہ قرآن مجید کے الفاظ میں یہ ہے:

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ط (اعراف : ۵۹)

اے قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمھارا کوئی الٰہ نہیں۔

ہود علیہ السلام فرماتے ہیں:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝

(اعراف : ٦٥)

اے قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں۔ کیا تم (عذاب الٰہی سے) ڈرتے نہیں؟

صالح علیہ السلام نے فرمایا:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ

(اعراف : ۷۳)

اے قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا کوئی تمہارا الٰہ نہیں۔

شعیب علیہ السلام نے کہا:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ

(اعراف : ۸۵)

اے قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ہے:

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۝ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْۤ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (شعراء : ۲۳ تا ۲۸)

فرعون نے کہا: رب العٰلمین سے کیا مراد ہے؟ موسیٰ نے کہا: آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ان کا رب، اگر تم یقین کرو۔ فرعون نے اپنے اردگرد والوں (حاضرینِ مجلس) سے کہا: سُن رہے ہو؟ موسیٰ نے کہا: وہ تمہارا اور تمہارے آباؤ اجداد کا رب ہے۔ فرعون نے

کہا : یہ تمھارا رسول جو (بزعم خود) تمھاری طرف رسول ہو کر آیا ہے بالکل مجنوں ہے۔ موسیٰ نے کہا : مشرق اور مغرب کا رب، اگر تم عقل سے کام لو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت بھی یہی تھی :

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ج (مائدہ : ۱۱۷)

یہ کہ تم اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب اور تمھارا بھی رب ہے۔

آخری پیغمبر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا بنیادی نکتہ بھی یہی تھا، فرمایا :

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔـا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ○ (آل عمران: ۶۴)

کہو، اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان متفق علیہ ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی بندگی کریں گے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک نہ کریں گے اور ہم میں سے کوئی شخص اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے شخص کو رب نہ بنائے گا۔

مذکورہ آیات سے بالکل واضح ہو گیا کہ ہر نبی و رسول کی دعوت کا مرکزی مضمون یہی تھا کہ ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کی جائے۔ اسی بات کو اصطلاحاً توحید الوہیت کہتے ہیں۔ توحید الوہیت کے مفہوم کو اور زیادہ واضح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ الٰہ اور عبادت کے معنی و مفہوم کو ٹھیک طور پر سمجھ لیا جائے۔

الٰہ کے لغوی معنی و مفہوم پر ہم آگے تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ یہاں مختصراً سمجھ لیں کہ الٰہ اس ہستی کو کہتے ہیں جو حیرت انگیز حد تک عظیم و برتر ہو، بے مثال طاقت و قوت کی مالک ہو، جو انسانوں کو مافوق الطبعی طور پر نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتی ہو، آفات و بلایا میں ان کی مدد گار ہو، جس کا حکم مانا جائے، جس کے

آگے سرِنیاز خم کیا جائے، مختصر یہ کہ جو مافوق الطبعی اقتدار و اختیار (Super Natural Power) کی مالک ہو۔

عبادت کے لغوی معنی غایت درجہ عجز و تذلّل کے ہیں چنانچہ جو راستہ آمد و رفت کی کثرت سے پامال ہو جاتا ہے "طریق معبّد" کہلاتا ہے، یہیں سے اس میں عاجزانہ اطاعت کے معنی پیدا ہو گئے اور اب یہ لفظ عام طور سے اسی معنی میں مستعمل ہے[1]۔

الٰہ اور عبادت کے ان لغوی مفہومات کے مطابق توحید الوہیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کی عاجزانہ بندگی کی جائے یعنی اسی کے سامنے سرِنیاز جھکایا جائے، اسی سے عقیدت و محبّت رکھی جائے، اسی کی تعظیم و ستائش کی جائے، اسی کے آگے دستِ سوال پھیلایا جائے، اسی کو مشکل کشا، فریاد رس اور نجات دہندہ سمجھ کر مصائب میں پکارا جائے اس کے علاوہ کسی اور کو ہرگز نہ پکارا جائے، اسی سے ڈرا جائے اور اسی سے ہر قسم کے نفع کی اُمید رکھی جائے بالفاظِ دیگر اللہ ہی قبلۂ حاجات، معبودِ حقیقی اور مرکزِ تعظیم و محبّت ہو۔ توحید الوہیت کے اس تصوّر کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ
أَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ أَعْبُدُ
اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ ج وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○
وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ج وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ○ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا
يَضُرُّكَ ج فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَإِنْ
يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ إِلَّا هُوَ ج وَإِنْ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں، راقم کی کتاب "سورۂ فاتحہ ایک تحقیقی مطالعہ" ص ۵۱ تا ۵۳

يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ
مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ (یونس : ۱۰۴ تا ۱۰۷)

کہہ دو کہ اے لوگو، اگر تم میرے دین کے متعلق کسی شک اور تردّد میں ہو تو (جان لو کہ) میں ان معبودوں کی بندگی نہیں کرتا جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر بندگی کرتے ہو بلکہ میں تو اس اللہ کی بندگی کرتا ہوں جو تمھیں وفات دیتا ہے، اور مجھے تو یہی حکم ہوا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں ہوں اور (یہ بھی حکم ہوا ہے کہ) تم یکسو ہو کر دین (توحید) کی طرف متوجہ رہو اور مشرکوں میں شامل نہ ہو جاؤ، اور (یہ بھی حکم ہوا ہے کہ) اللہ کو چھوڑ کر تم (آفات وحاجات میں) کسی اور کو نہ پکارو جو نہ تمھیں نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، اور اگر تم نے ایسا کیا تو تمھارا شمار ظالموں (مشرکوں) میں ہوگا۔ اور اگر اللہ تمھیں کسی تکلیف میں ڈال دے تو اس کے سوا کوئی دوسرا اس کو دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تم کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی روکنے والا بھی نہیں۔ اس فضل سے وہ اپنے جس بندے کو چاہتا ہے نوازتا ہے، اور وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

توحید ربوبیت

توحید ربوبیت کے دو پہلو ہیں، ایک کا تعلق عالم تکوینی سے اور دوسرے کا تعلق عالم تشریعی (تمدنی زندگی) سے ہے۔ عالم تکوینی میں توحید ربوبیت کا مطلب ہے کہ اللہ ہی جملہ مخلوقات کا خالق اور ان کا پرورش کنندہ ہے اور اسی کے ہاتھ میں ان کی زندگی اور موت ہے۔ ان تکوینی امور (خلق، رزق اور احیاء واماتت) میں کوئی مخلوق ادنیٰ شرکت بھی نہیں رکھتی اس لیے کہ کوئی مخلوق نہ کسی چیز کو پیدا کرسکتی ہے، نہ کسی ذی حیات کی زندگی اور موت اس کے اختیار میں ہے اور نہ ہی آسمان اور زمین سے وہ کسی کو مافوق الطبعی طور پر رزق مہیا کرنے کی طاقت رکھتی

ہے۔ یہ سب امور خالق کائنات کے لیے مخصوص ہیں۔ اس تکوینی حقیقت پر قرآن مجید میں ایک جگہ ان لفظوں میں روشنی ڈالی گئی ہے :

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَاءَ بِنَاءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرہ : ۲۱ ، ۲۲)

اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں تاکہ تم (جہنم کی آگ سے) بچ سکو، اور جس نے زمین کو تمھارے لیے فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس کے ذریعہ تمھارے لیے بطور غذا پھل پیدا کیے، اس لیے تم دیدہ ودانستہ اللہ کے مقابل نہ بناؤ۔

دوسری جگہ ہے :

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○ (یونس: ۳۲،۳۱)

تم ان مشرکین سے پوچھو کہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے اور وہ کون ہے جو تمھارے کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے اور وہ کون ہے جو جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے نکالتا ہے اور وہ کون ہے جو (کائنات کی) تدبیر امر کرتا ہے؟ وہ کہیں گے اللہ، تو ان سے کہو کہ پھر (شرک سے) کیوں نہیں پرہیز کرتے۔ فی الواقع یہی اللہ تمھارا رب ہے پس

حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے، آخر تم کدھر پھرائے جا رہے ہو؟

مذکورہ تکوینی امور میں کسی مخلوق کو شریک کرنا بدترین شرک ہے اور اسے اصطلاح شرع میں "اشراک فی الربوبیت" کہا جاتا ہے۔

عالمِ تشریعی میں توحیدِ ربوبیت کا مطلب ہے کہ اللہ جس طرح عالمِ تکوینی کا بلاشرکتِ غیرے حاکم و فرماں روا ہے اسی طرح انسان کی اجتماعی یعنی تمدنی زندگی کا بھی حاکم علی الاطلاق ہے جیساکہ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○

(اعراف: ۵۴)

سُن لو کہ خلق بھی اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے، اللہ کی ذات جو سارے جہانوں کا آقا اور پروردگار ہے، بہت بلند ہے اور پاک ہے (خلق یا امر میں کسی مخلوق کی شرکت سے)۔

ہمارے اکثر مفسّرین نے امر[1] کو صرف عالم تکوینی تک محدود قرار دیا ہے لیکن یہ ایک بڑی غلطی ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کا تعلق عالم تکوینی کے ساتھ عالم تشریعی سے بھی ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ○ (طلاق: ۸)

اور بہت سی بستیاں تھیں جنھوں نے اپنے رب کے حکم سے اور اس کے رسولوں سے سرتابی کی سو ہم نے ان کا سخت محاسبہ کیا اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سزا دی۔

دوسری جگہ ہے:

---

[1] قرآن مجید میں قانون الٰہی کے معنی میں چار لفظ استعمال کیے گئے ہیں، امر[1]، حکم[2]، حدود اللہ[3] اور دین[4]۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (مائدہ: ۵۰)

کیا پھر یہ لوگ (زمانہ) جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ اور ان لوگوں کے لیے جو صاحب ایمان ویقین ہیں اللہ سے بہتر حکم دینے والا کون ہوسکتا ہے؟

ایک اور مقام پر ہے:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (آل عمران: ۸۳)

کیا وہ اللہ کے دین (ضابطۂ حیات) کے سوا اور کسی دین (ضابطہ) کو چاہتے ہیں جب کہ آسمانوں اور زمین میں جو وجود بھی ہے چار ونا چار اسی کے آگے سر اطاعت جھکائے ہوئے ہے اور سب کو (ایک روز) اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

لیکن ان دونوں اقتدارات کی نوعیت میں تھوڑا فرق ہے۔ عالم تکوینی میں اللہ کا اقتدار مخلوقات کی رضا و رغبت کے بغیر نافذ ہے اور اس میں کسی کو چون وچرا کی مجال نہیں، اسی کو آیۂ مذکورہ میں طوعًا وکرہًا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن عالم تشریعی میں یہ بالجبر نافذ نہیں ہے بلکہ اسے انسانوں کے اختیار پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی مرضی اور خوشی سے اسے قبول کریں چنانچہ اس غرض کے لیے ہر دور میں انبیاء ورسل کو بھیجا گیا کہ وہ انھیں امر الٰہی سے آگاہ کردیں اور ساتھ ہی یہ تلقین بھی کردیں کہ ہر حال میں حتی الوسع وہ صرف اس کے بھیجے ہوئے احکام وقوانین کی پیروی کریں، کسی اور کے وضع کردہ قوانین پر نہ چلیں جیسا کہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (نحل: ۳۶)

ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر ضرور بھیجا ہے (اس پیغام کے ساتھ) کہ تم اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت (کی بندگی) سے بچو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ توحید کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اللہ کو عالم تکوینی میں حاکم و فرماں روا مان کر اس کی عبادت کی جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ زمین کا حاکم علی الاطلاق اسی کو مانا جائے اور زندگی کے ہر معاملے میں حق المقدور اسی کے قانون کی اتباع کی جائے۔ اللہ کی اطاعت اور طاغوت کی اطاعت ایک ساتھ نہیں چل سکتی ہے۔ جو شخص برضا و رغبت اللہ کے قانون کو نظر انداز کر کے کسی انسان کے قانون کی اتّباع کرتا ہے وہ شرک فی الحکم کا مرتکب ہے۔ اسی طرح جو شخص اللہ کے قانون کی جگہ اپنا وضع کردہ قانون چلاتا ہے وہ قرآن مجید کی اصطلاح میں طاغوت[1] یعنی اللہ کا باغی ہے۔ اہل ایمان کے لیے لازم ہے کہ وہ حتی الامکان اللہ کے باغیوں کی اطاعت و اتّباع سے بچیں (واجتنبوا الطاغوت) گویا ایمان باللہ کا لازمی تقاضا کفر بالطاغوت ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ

---

[1] ہمارے بہت سے مفسرین نے طاغوت کا ترجمہ صرف بُت یا شیطان کیا ہے حالانکہ اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ طاغوت، طغیان سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے حد سے آگے بڑھ جانا۔ قاموس (ج ۴ ص ۳۵۷) میں ہے "طاغوت سے لات، عزیٰ، کاہن، شیطان، گمراہی کا سرغنہ، اصنام اور ہر وہ جس کی اللہ کے سوا بندگی کی جائے اور اہل کتاب کے سرکش لوگ مراد ہیں"۔ راغب نے مفردات (ص ۳۰۷) میں لکھا ہے: عبارۃ عن کل متعد و کل معبود من دون اللہ "طاغوت سے تعدی کرنے والے اور اللہ کے سوا سب معبود مراد ہیں"۔ لسان العرب (ج ۱۵ ص ۹) میں بھی اسی طرح ہے۔

قرآن مجید میں اس کے مواقع استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ طاغوت سے مراد ہر وہ مخلوق ہے جو اللہ سے بغاوت کی راہ اختیار کرے یا دوسرے لفظوں میں بندگی کی حد سے گزر جائے خواہ وہ شیاطین ہوں اور خواہ سرکش انسان۔ سرکش انسانوں کے لیے یہ لفظ متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے، دیکھیں: بقرہ: ۲۵۷، نسآء: ۵۱، ۶۰، زمر: ۱۷۔

بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى لَا انۡفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۝

(بقرہ : ۲۵۶)

جس شخص نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ کا اقرار کر لیا اس نے بڑا مضبوط حلقہ (سہارا) پکڑ لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔

قرآن مجید کی اس واضح ہدایت کے باوجود آج اکثر مسلمانوں کے ذہن سے یہ بات بھی نکل چکی ہے کہ شرک کی ایک قسم شرک فی الحکم بھی ہے۔ جن ملکوں میں مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہے وہاں بھی وہ اس شرک سے محفوظ نہیں ہیں اور اطمینان کے ساتھ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی پیروی کر رہے ہیں اس سے نہ ان کی توحید پر حرف آتا ہے اور نہ دین وایمان کے تقاضے مجروح ہوتے ہیں۔ ان ملکوں میں شرک جلی (تکوینی شرک) کے مظاہر بھی عام ہیں۔

سیاسی اطاعت کے ساتھ مذہبی اطاعت کا بھی مسئلہ ہے۔ کیا علماء اور مذہبی پیشواؤں کو صاحب امر و نہی ماننا اور ان کی غیر مشروط اطاعت کرنا اشراک فی الحکم میں داخل ہے؟ یہ سوال اس وقت زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے جب ہماری نظر قرآن مجید کی درج ذیل آیات پر جاتی ہے:

(۱) قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيۡنَنَا وَ بَيۡنَكُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشۡرِكَ بِهٖ شَيۡـئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ

(آل عمران : ۶۴)

اے پیغمبر کہہ دو کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان متفق علیہ ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی بندگی کریں گے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک نہ ٹھہرائیں گے اور ہم میں سے کوئی شخص اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے شخص کو رب نہ بنائے گا۔

(۲) اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ
الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ج وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰـهًا
وَّاحِدًا ج لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

(التوبہ : ۳۱)

انھوں (نصاریٰ) نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو رب بنا رکھا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ الٰہ واحد کی بندگی کریں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ پاک ہے ان کی مشرکانہ باتوں سے۔

مؤخر الذکر آیت میں نصاریٰ پر الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ مسیح کے ساتھ اپنے علماء اور درویشوں کو "اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" بنا رکھا ہے۔ کیا وہ فی الواقع اپنے علماء اور درویشوں کی پرستش کرتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ معروف معنوں میں ایسا نہیں کرتے تھے پھر اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے جیساکہ عدی بن حاتم کی حدیث[1] سے تائید ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے علماء اور درویشوں (مشائخ) سے اظہار محبّت وعقیدت میں غلو کرتے تھے اور روحانی طور پر انھیں صاحب تصرّف سمجھتے تھے بلکہ ان کو صاحب امر ونہی بھی مانتے تھے یعنی اللہ کے حکم کی سند کے بغیر ان کے ہر حکم کو واجب الاطاعت سمجھ کر بجا لاتے تھے اور یہی ان کو رب بنا لینا ہے۔

ہم آج بچشم سر دیکھتے ہیں کہ بہت سے ناخواندہ اور نیم خواندہ مسلمان، علماء،

---

[1] حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن عدی بن حاتم قال: اتیت النبی صلی الله علیه وسلم وفی عنقی صلیب من ذهب، فقال: یاعدی اطرح عنك هٰذا الوثن، وسمعته یقرأ فی سورة براءة (اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ) قال: اما انهم لم یکونوا یعبدونهم ولکنهم کانوا اذا احلّوا لهم شیئًا استحلوه واذا حرّموا علیهم شیئًا حرّموه (ترمذی ج ۲ ص ۳۴۲ ومسند احمد)

اور مذہبی پیشواؤں سے غیر معمولی عقیدت و محبّت رکھتے ہیں یہاں تک کہ جوشِ عقیدت میں ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے اور تعظیماً نیم خمیدہ ہو جاتے ہیں حالانکہ اس نوع کی عقیدت و محبّت کی اصل مستحق اللہ رب العزّت کی ذات ہے (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ) (بقرہ : ۱۶۵) "جو ایمان والے ہیں وہ اللہ ہی سے شدید محبّت رکھتے ہیں" ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مذہبی پیشواؤں کی ہر بات ان کے متبعین کے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے اور آنکھ بند کر کے اس کی پیروی کی جاتی ہے، یہ بھی عام مشاہدہ ہے کہ حاجات و بلایا میں ان سے دعا کی درخواست کی جاتی ہے محض اس خیال سے کہ وہ مستجاب الدّعوات ہیں دوسرے لفظوں میں اگر وہ اللہ سے کہہ دیں تو ان کا کام ضرور ہو جائے گا یا ان کی مصیبت دور ہو جائے گی حالانکہ قرآن مجید کی واضح تعلیم ہے: اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (مومن : ۶۰) "مجھے پکارو میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا۔"

ہم کسی خوف تردید کے بغیر کہتے ہیں کہ علماء اور مذہبی پیشواؤں سے تعظیم کی بنا پر غیر معمولی عقیدت و محبّت رکھنا، ان کو صاحب امر و نہی سمجھنا یعنی اللہ کی سند کے بغیر ان کے حکم کو بجا لانا اور حاجات و بلایا میں اس تصوّر کے ساتھ ان سے دعا کی درخواست کرنا کہ اللہ کے یہاں لازماً ان کی سنی جاتی ہے کھُلا ہوا شرک ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ دراصل انھیں "اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" قرار دیتے ہیں خواہ شعوری طور پر انھیں اس کا احساس نہ ہو۔ اگر کوئی شخص ان افعال کو شرک نہیں سمجھتا ہے تو پھر اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ نصاریٰ پر قرآن مجید نے جو الزام لگایا ہے کہ وہ اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنا لیتے ہیں وہ (نعوذ باللہ) غلط ہے۔

ارباب حکومت اور مذہبی پیشواؤں کے علاوہ بھی اطاعت کی جتنی صورتیں دنیوی زندگی میں ملتی ہیں مثلاً والدین کی اطاعت، معلّمین کی اطاعت، قبائل کے سرداروں کی اطاعت، خاندان کے بزرگوں اور برادریوں کے چودھریوں کی اطاعت، کارخانوں اور تعلیم گاہوں کے ارباب بست و کشاد کی اطاعت وغیرہ سب اللہ

کی اطاعت کے تحت ہیں، یعنی اسی وقت تک ان کی اطاعت جائز ہے جب تک وہ اللہ کی اطاعت سے متصادم نہ ہو۔ قرآن کریم میں والدین کی اطاعت کے ضمن میں اس بات کو بالکل واضح کر دیا گیا ہے، فرمایا:

وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا

(لقمان: ۱۵)

اگر وہ دونوں تم پر اس بات کے لیے دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ جس کی تمہارے پاس کوئی علمی دلیل نہیں ہے تو ان کی بات ہرگز نہ مانو البتہ دنیا میں ان کے ساتھ بھلے ڈھنگ سے زندگی بسر کرو۔

اور حدیث رسول میں ہر غیر اللہ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت سے متصادم ہونے کی شکل میں ممنوع قرار دیدیا گیا ہے، ارشاد ہے: لا طاعة فی معصیة الله انما الطاعة فی المعروف[1] "کسی بھی مخلوق کی اطاعت اس وقت جائز نہیں جب اس سے خالق کی نافرمانی ہوتی ہو۔ اطاعت صرف معروف میں جائز ہے۔"

یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ اگر کوئی شخص توحید ربوبیت کا قائل ہے یعنی اللہ کو اپنا خالق و مالک مانتا ہے لیکن توحید الوہیت کو تسلیم نہیں کرتا یا اس کو نظر انداز کر دیتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔ توحید خالص میں توحید ذات و صفات کے ساتھ توحید الوہیت و ربوبیت بھی شامل ہیں، ان میں سے کسی بھی جزء کو کسی حال میں بھی ترک نہیں کیا جا سکتا ہے۔

دو اہم توحیدی اصطلاحات

توحید الوہیت و ربوبیت کی وضاحت میں ہم نے گزشتہ صفحات میں

---

1. مسلم ج ۳ ص ۱۴۶۹، نسائی ج ۸ ص ۱۶۰۔

جو کچھ لکھا ہے اس سے کسی حد تک یہ بات واضح ہوگئی کہ الٰہ اور رب قرآن مجید کی دو اہم توحیدی اصطلاحات ہیں اور ان کے مفہوم کو ٹھیک طور پر سمجھے بغیر قرآنی توحید کی حقیقت کو پورے طور پر سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

اکثر علماء نے الٰہ و رب کو باعتبارِ مفہوم مرادف اصطلاحیں قرار دیا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اپنی کتاب "قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں" میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ یہ ایک بڑی غلطی ہے۔ دونوں اصطلاحوں میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے ہی صرف توحید ربوبیت کے قائل کو صوفیہ نے مسلمان قرار دیا ہے اور اسی بنا پر بعض علماء نے "اشراک فی الحکم" کے مرتکب کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ الٰہ و رب دو علیٰحدہ قرآنی اصطلاحیں ہیں۔ اگر قرآن مجید میں ان کے مواقع استعمال پر سنجیدگی سے غور کر لیا گیا ہوتا تو مذکورہ غلط فہمی پیدا نہ ہوتی۔ الٰہ کے لغوی معنی معبود کے اور اصطلاحی معنی مقتدرِ اعلیٰ کے ہیں۔ لیکن ہر صاحب اقتدار کو الٰہ نہیں کہیں گے۔ اس کو اسی وقت الٰہ کہا جائے گا جب اس کا اقتدار مسلّم ہو، اس کے آگے سرِ نیاز خم ہوں اور وہ لوگوں کے حقیقی خوف اور امید کا مرجع بن جائے۔ قرآن مجید نے اس اصطلاحی مفہوم میں مزید اضافہ کیا ہے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

اس کے برخلاف رب کے لغوی معنی مربّی، آقا اور مالک کے اور اصطلاحی معنی حاکمِ علی الاطلاق کے ہیں۔ قرآن مجید نے تکوینی اور تشریعی دونوں طرح کی حاکمیت پر اس کا اطلاق کیا ہے۔ ان دونوں اصطلاحات (الٰہ و رب) سے قرآن مجید اس تصوّر کو واضح کرتا ہے کہ اللہ جو اس کائنات کا مقتدرِ اعلیٰ ہے وہی عملاً اس پر حکومت بھی کرتا ہے دوسرے لفظوں میں اقتدار اور حاکمیت دونوں ایک ہی ذات میں مرتکز ہیں۔ ان میں نہ تو تعدّد ممکن ہے اور نہ ہی شرکت۔

اگلے صفحات میں ان دونوں اصطلاحات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور ان کی روشنی میں قرآن مجید کے تصوّر توحید کو مزید واضح کیا گیا ہے۔

الٰہ

لغوی معنی

اس بات پر اکثر علمار نحو کا اتفاق ہے کہ اللہ کا لفظ اِلٰہ سے بنا ہے[1] لیکن خود الٰہ کی اصل و معنی میں اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں علمار لغت کے متعدد اقوال ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔

(۱) اَلہ یَاْلہ اِلٰھًا، ای تحیّر[2]، یعنی تحیّر کے معنی

(۲) اِلٰہ کی اصل وِلاہ ہے[3]، لسان العرب میں ہے[4]: واصلہ ولاہ فقلبت

---

[1] اکثر علمار لغت کا یہ خیال ہے کہ اللہ کی اصل الٰہ ہے، ہمزہ کو حذف کرکے اس کے بدلے میں "ال" تعریف کا اضافہ کردیا گیا ہے اور اس بات کی دلیل کہ "ال" تعریف ہمزہ کے بدلے میں آیا ہے یہ ہے کہ ندا کی صورت میں ہمزہ قطعی ہے اور واضح طور پر پڑھا جاتا ہے جیسے یا اللہ۔ ابو فارس نحوی کی یہی رائے ہے۔ (الصحاح بذیل مادہ ال ہ) المنذری کا قول ہے کہ ابو الھیثم سے جب اللہ کے اسم کی لغوی تحقیق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ حقیقت میں یہ اِلاہ تھا، ال تعریف داخل کیا گیا تو اُلاِلٰہ ہوگیا پھر تخفیف کے لیے ہمزہ کو گرا دیا گیا اور ہمزہ کی حرکت لام کو دے دی گئی چنانچہ وہ اُللاہ ہوگیا اور اس طرح چونکہ لام تعریف متحرک ہوگیا تھا جو ہمیشہ ساکن ہوتا ہے اور دو ہم جنس حروف یعنی دو متحرک لام ایک جگہ جمع ہوگئے تھے اس لیے پہلے لام کو دوسرے لام میں مدغم کردیا گیا اور اللّٰہ ہوگیا۔ (لسان العرب و تاج العروس بذیل مادہ ال ہ)
(تفصیل کے لیے دیکھیں، دائرۃ المعارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۶۸ء ج ۳ ص ۱۴۴)

[2] لسان العرب، طبع بیروت ج ۱۳ ص ۴۶۹

[3] خلیل بن احمد (امام البصریین فی النحو واللغۃ وشیخ سیبویہ والمؤسس الحقیقی لعلم النحو) کا یہ مذہب ہے۔ اس خیال کے مطابق ولاہ کے معنی اللہ کی ذات میں ولہ و تحیّر کے ہیں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الواو همزة كما قالوا للوشاح إشاح و للوجاج إجاج، ومعنى ولاه أن الخلق يولهون إليه في حوائجهم ويضرعون إليه فيما يصيبهم و يفزعون اليه في كل ما ينوبهم كما يوله كل طفل إلى أمه" اس کی اصل " ولاہ " ہے، واو کی جگہ ہمزہ نے لے لی ہے جیسے وشاح کو إشاح اور وجاج کو إجاج کہا جاتا ہے۔ ولاہ کے معنی ہیں کہ مخلوق اپنی حاجت براری کے لیے اس کی طرف رجوع کرتی ہے، مصائب میں اس کی طرف عاجزانہ لپکتی ہے اور جملہ پیش آمدہ حادثات میں اس کی جناب میں روتی اور گڑگڑاتی ہے۔ ٹھیک اس طرح جیسے بچّہ ایسے موقع پر اپنی ماں کی آغوش ڈھونڈتا ہے۔[۱]

(۳) الٰہ کی اصل إلاہ ہے، لسان العرب میں ہے[۲]: اصله إلاه على فعال

(حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ)

(دیکھیں: اشتقاق اسماء اللہ ص ۲۶ و مقاییس اللغۃ (ول) ۶/۱۴۰)

[۴] لسان العرب ج ۱۳ ص ۶۶۸

---

[۱] مولانا روم نے الٰہ کے اس مفہوم کو اپنی مثنوی میں نہایت عمدہ طور پر باندھا ہے، فرماتے ہیں:

معنی اللہ گفت آں سیبویہ — یولھون فی الحوائج ھم لدیہ

گفت الھنا فی حوائجنا الیک — والتمسناہ وجدناہ لدیک

صد ہزاراں عاقل اندر وقت درد — جملہ نالاں پیش آں دیّان فرد

"سیبویہ (امام نحو) نے اللہ کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ اللہ وہ ذات ہے کہ جس کے حضور میں لوگ گڑگڑا کر اپنی حاجتیں پیش کرتے ہیں۔ لوگ اس کی جناب میں یوں دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہم تیری ہی جناب میں اپنی حاجت براری کے لیے التماس کرتے ہیں اور تیرے ہی در سے ہم اپنا دامن مراد بھرتے ہیں۔ لاکھوں اربابِ عقل و دانش مصیبت کی گھڑیوں میں اسی حاکم علی الاطلاق کی جناب میں نالہ و فریاد کرتے ہیں۔"

[۲] لسان العرب ج ۱۳ ص ۶۶۹

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بمعنى مفعول، لأنه مالوه أى معبود، كقولنا إمام على فعال بمعنى مفعول لأنه مُؤتم به، فلما دخل عليه الا لف و اللام حذفت الهمزه تخفيفا لكثرته فى الكلام " اس کی اصل إلاہ ہے فعال کے وزن پر مفعول کے معنی میں یعنی مالوہ بمعنی معبود جیسے إمام فعال کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے اس لیے کہ اس کی اقتدا و پیروی کی جاتی ہے۔ جب اس پر الف لام داخل کیا گیا تو ہمزہ کو تخفیف کی غرض سے حذف کر دیا گیا۔ کلام عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔"

(۴) اللہ کی اصل " لاہ " ہے فَعَل کے وزن پر۔ جب اس پر الف لام تعریف کا داخل ہوا تو اللہ ہو گیا[۱] اعشیٰ کا شعر ہے:

كحلفة من ابى رباح　　　يسمعها لاهه الكبار

"ابو رباح کی قسم کی مانند جس کو اس کا بڑا دیوتا سنتا ہے۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

جب ہمزہ کو تخفیف کی غرض سے حذف کر دیا گیا تو دو لام جمع ہو گئے اس لیے پہلا لام دوسرے لام میں مدغم ہو گیا اور اس طرح اللہ ہو گیا۔ جیسے " النّاس " کی اصل " الأناس " ہے لیکن ہمزہ کو حذف کر دینے سے " النّاس " ہو گیا۔ اللہ میں الف لام تعریف کا نہیں بلکہ ہمزہ محذوف کے عوض میں ہے اس لیے وہ اس کا جزو لازم بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس پر حرف نداء داخل ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے: "یا اللہ اغفرلنا" یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ جس اسم پر الف لام داخل ہوتا ہے اس پر حرف نداء نہیں آتا مثلاً "یا الرجل اقبل" "یا الغلام هلمّ" کہنا صحیح نہ ہو گا کیونکہ ایک ہی اسم پر دو مختلف علامات تعریف داخل نہیں ہو سکتی ہیں۔

الٰہ کی اصل کے بارے میں کسائی (امام الکوفیین فی النحو واللغۃ۔ متوفی ۱۸۹ھ) فراء (شاگرد کسائی، متوفی ۲۰۷ھ) قطرب (نحوی، متوفی ۲۰۶ھ) اور اخفش (شاگرد سیبویہ و امام البصریین فی النحو بعد سیبویہ، متوفی ۲۱۰ھ) کا یہی مذہب ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۵) اعتماد کے معنی بھی آتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں[۱]: أَلهت إلى فلان أَلهًا أی فزعت الیه و اعتمدت إلیه "میں نے اس کی جناب میں زاری کی اور اس پر بھروسہ کیا۔"

(۶) اس میں سکون کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے، بولتے ہیں: أَلهت إلى فلان أی سکنت الیه "یعنی میں نے اس کی طرف رجوع کیا اور وہاں سکون حاصل ہوا۔"

(۷) اس کے ایک معنی کسی کی جانب غایت شوق سے متوجہ ہونے کے ہیں: أَله الرجل إلى الرجل أی اتجه إلیه لشدة شوقه إلیه۔ اسی طرح ہے: أله الأم إلى ولدها أی حنت إلیه یعنی ماں بچّے کی طرف غایت محبّت اور دلسوزی سے متوجہ ہوئی یا اس کی مشتاق ہوئی (قاموس)

(۸) بعض علمار لغت نے اسے لاہ یلیہ سے مشتق مانا ہے: لاہ یلیہ لیھا ولاھا اذا احتجب یعنی نگاہوں سے پوشیدہ ہونا۔ (تاج العروس)

(۹) بعض علمار نے اسے تألّه سے مشتق بتایا ہے[۲]۔ اس کے معنی عبادت و بندگی کے ہیں، کہا جاتا ہے: أَلَهَ إلٰهةً یعنی اس نے عبادت کی عبادت کرنے کی طرح۔

(۱۰) ایک خیال یہ بھی ہے کہ اللہ ایک اسم ہے جو صرف اللہ عزّ وجلّ کے لیے ہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

(دیکھیں، اشتقاق اسماء اللہ، ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن اسحاق زجاجی ص ۲۳-۲۴)

لہ یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ وہ یہ بھی مانتا تھا کہ إلٰہ کی اصل "إلاہ" بھی ہوسکتا ہے (اشتقاق اسماء اللہ ص ۲۷) صحاح میں ہے کہ جب "لاہ" پر الف لام تعریف کا داخل کیا گیا تو اسے اسم علم کا قائم مقام تصور کر لیا گیا جیسا کہ ابوالعباس اور الحسن اسم علم کے قائم مقام تصوّر کیے جاتے ہیں (بذیل مادہ ال ہ)

---

۱ شیخ عبدالقادر جیلانی، غنیۃ الطالبین ص ۲۹۴۔

۲ غنیۃ الطالبین ص ۲۹۴۔

موضوع ہے۔ اس کی اصل إلَاہ ، وِلَاہ اور لَاہ میں سے ایک بھی نہیں ہے[1]۔
عربی لغت اور علماء کی تشریحات سے واضح ہوگیا کہ مادہ "ال ہ" (الٰـہ) کے اندر تحیّر، رغبت واشتیاق، جزع وفزع، طلب حاجت وامان، اطاعت واقتدار، اعتماد وسکون، پوشیدگی اور عبادت وبندگی کے معانی پائے جاتے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ قرآن مجید نے الٰہ کو کن معنوں میں استعمال کیا ہے۔

قرآنی معنی

الٰہ کا لفظ قرآن مجید میں بکثرت استعمال ہوا ہے اور بیشتر مقامات پر اس کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے کہ اس کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں۔ لیکن چند مقامات ایسے بھی ہیں جہاں اس لفظ کی نسبت غیر اللہ کی طرف کی گئی ہے۔ ان مقامات کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو جانا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید نے الٰہ کے مذکورہ بالا لغوی معانی میں سے کن معانی کو ترجیح دی ہے اور انھیں الٰہ کے اصل معنی کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ ہم یہاں صرف اُن تین آیات سے بحث کریں گے جن میں الٰہ کی نسبت غیر اللہ کی طرف کی گئی ہے:

(۱) اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (فرقان: ۴۳)
کیا تم نے اس شخص کا حال دیکھا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو الٰہ (معبود) بنا لیا ہے۔

اس آیت میں خواہشاتِ نفس کو الٰہ بنا لینے کی بات کہی گئی ہے جس کا واضح مطلب نفس کی اطاعت ہے۔ اگر کوئی شخص خواہشات نفس ہی کو اپنی تمام توجہات کا مرکز بنالے، ان پر اس درجہ فریفتہ ہو جائے کہ اپنی زندگی کی لگام ان کے ہاتھ میں دیدے، جس طرف وہ اس کو لے جائیں آنکھ بند کر کے اس طرف چل پڑے، جبر کے ساتھ نہیں خوشی خوشی، پورے میلان قلب کے ساتھ تو کہا جائے گا کہ اس نے اپنے

---

[1] یہ ابو عثمان مازنی کا مذہب ہے، دیکھیں اشتقاق اسماء اللہ ص ۲۸۔

نفس کو الٰہ بنالیا ہے یعنی وہی اس کا معبود ہے۔

اس آیت کے مطابق الٰہ وہ ہے جس کی تابعداری کی جائے، جس کے حکموں پر برضا و رغبت چلا جائے یعنی الٰہ بمعنی مطاع۔

(۲) وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ○

(مریم: ۸۱)

ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور الٰہ بنالیے ہیں تاکہ وہ ان کے مددگار ہوں۔

اس آیت میں غیر اللہ کو الٰہ بنالینے کی جس غرض کا ذکر ہوا ہے اس کے لیے "عزًّا" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ عزّا، عزّ یعزّ کا مصدر ہے۔ اس کے معنی قوت و غلبہ کے ہیں، تاج العروس میں ہے:

العزّ فی الاصل القوة والشدة والغلبة والرفعة والامتناع۔

عز کے معنی اصل میں قوی ہونا، سخت ہونا، غلبہ پانا، بلند ہونا اور محفوظ ہونا ہیں۔

ابن القطاع نے کتاب الافعال میں اس کے معنی اعانت کرنے کے لکھے ہیں، قرآن مجید کی ایک آیت سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے، فرمایا:

فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ط (احقاف: ۲۸)

اللہ تعالیٰ کے سوا جن ہستیوں کو انھوں نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنا رکھا ہے، انھوں نے اس کی مدد کیوں نہ کی؟

اردو کے اکثر مفسرین نے اس کا ترجمہ "مددگار" کیا ہے، شاہ عبدالقادر نے "مدد" کیا ہے۔ بہرحال اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ الٰہ کے ایک معنی پشتیبان اور مددگار کے بھی ہیں، ایسا مددگار جس کی شوکت و قوت بے اندازہ ہو، جو سب پر غالب ہو اور اس پر کوئی غالب نہ آسکے، جو سب سے بلند و بالا ہو اور جس تک

براہ راست کسی کی دسترس نہ ہو۔

(۳) قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِىْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ○

(شعراء : ۲۹)

فرعون نے کہا: اگر تم نے میرے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا الٰہ بنایا تو میں تم کو قید خانے میں ڈال دوں گا۔

اس آیت میں الٰہ "مقتدر اعلیٰ"[1] اور "حاکم علی الاطلاق" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ الٰہ کے اصطلاحی معنی ہیں۔[2]

متذکرہ قرآنی معانی کے مطابق الٰہ کا اطلاق اس ہستی پر ہوگا جو طاقت و قوت میں بے مثال ہو، جو سب پر غالب ہو لیکن اس پر کوئی غالب نہ آسکے، جس کے آگے سر نیاز خم کیا جائے، جبر کے ساتھ نہیں بلکہ دل کی کامل رضا و رغبت کے ساتھ، اور جو مافوق الطبعی طور پر مخلوق کی حاجت روا، مشکل کشا اور نجات دہندہ ہو۔

اس سلسلے میں قرآن مجید کا بیان ہے کہ متذکرہ بالا صفات صرف خالق کائنات کے لیے مخصوص ہیں اس میں کوئی مخلوق خواہ ارضی ہو یا سماوی کسی نوع کی کوئی شرکت نہیں رکھتی۔ لیکن نزول قرآن سے پہلے جو قومیں گذر چکی تھیں اور وہ بھی جو عہد نزول میں موجود تھیں سب کسی استثناء کے بغیر خالق کائنات کے علاوہ بعض ارضی اور

---

[1] یہ انگریزی لفظ (Sovereign) کا مترادف ہے اور یہ لاطینی لفظ (Sovernus) سے نکلا ہے جس کے معنی برتر کے ہیں۔ اس سے مراد ایسی زبردست طاقت ہے جس سے برتر کوئی دوسری طاقت نہ ہو، جس کے سامنے سب جوابدہ ہوں لیکن وہ خود کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو، بالکل آزاد و خود مختار ہو، جس شخص یا جماعت کو یہ ہمہ گیر طاقت حاصل ہو اسے جدید سیاسی اصطلاح میں مقتدر اعلیٰ یا حاکم علی الاطلاق کہا جاتا ہے۔

[2] اگر اس کے لغوی معنی لیے جائیں تو بھی مفہوم میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا یعنی الٰہ بمعنی مطاع جیسا کہ اوّل الذکر آیت میں بیان کیا جا چکا ہے۔

سماوی مخلوقات کو بھی اس میں حصہ دار سمجھتی تھیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے گمراہ قوموں کے ان تخیّلات کو بیان کر دیا جائے تاکہ الٰہ و رب کے قرآنی تصوّر کے بیان سے پہلے شرک کی حقیقت پورے طور پر واضح ہو کر سامنے آ جائے۔

اُمم سابقہ کا تصوّر الٰہ

گذشتہ تمام قوموں کی یہ مشترکہ گمراہی تھی جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ وہ خالق کائنات کو چھوڑ کر اس کی بعض مخلوقات بالخصوص اجرام سماویہ کو عالم اسباب پر حکمراں سمجھتی تھیں چنانچہ حاجات و بلایا میں ان کی طرف رجوع کرتی تھیں اور ان کو خوش کرنے کے لیے بہت سے مراسم تعظیم ادا کرنے کے علاوہ ان کے حضور میں نذر و نیاز بھی پیش کرتی تھیں۔ ہم یہاں صرف انہی گمراہ قوموں کے تصوّر الٰہ پر گفتگو کریں گے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے:

قوم نوح

قرآن مجید کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم اسی گمرہی میں مبتلا تھی جس کا ابھی اوپر ذکر ہوا یعنی خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی پرستش۔ ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر اُن کے الٰہ (معبود) تھے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا

وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝ (نوح: ۲۳)

انھوں نے (اپنے پیروؤں سے) کہا کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور (بالخصوص) ود، سواع، اور یغوث کو، اور یعوق و نسر کو بھی نہ چھوڑنا۔

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مذکورہ معبود دراصل ان کی قوم کے وفات یافتہ نیک لوگ تھے چنانچہ صحیح بخاری[1] میں عبداللہ بن عباس سے یہ روایت منقول

---

[1] صحیح بخاری، الجزء السادس، کتاب التفسیر (سورۂ نوح) ص ۱۹۹ (مطبوعہ مصر)

ہے کہ :

"ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر قوم نوح کے نیک لوگوں کے نام ہیں جب وہ مر گئے تو شیطان نے ان کی قوم کے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کیا کہ وہ ان لوگوں کی نشست گاہوں پر جہاں وہ بیٹھا کرتے تھے پتھروں کے نشان قائم کریں اور ان پتھروں کو انہی مردہ لوگوں کے نام سے موسوم کریں چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا لیکن ان نشانوں کی عبادت اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک وہ واقف کار لوگ مر نہ گئے۔ جب لوگوں میں سے علم اٹھ گیا تو پھر ان کی عبادت ہونے لگی۔"

فتح الباری میں مندرج یہ روایت بھی ملاحظہ ہو[1]:

"فاکہی عبید اللہ بن عبید بن عمیر کے طریق سے روایت کرتا ہے کہ اصنام کی ابتدا نوح علیہ السلام کے عہد سے ہوئی۔ بیٹے آباء کے فرماں بردار تھے۔ ایک شخص مر گیا تو اس کا بیٹا صبر نہیں کر پا رہا تھا چنانچہ اس نے باپ کی صورت پر ایک مجسمہ بنا لیا اور جب بھی اس کے اندر اشتیاق دید پیدا ہوتا اسے دیکھ لیتا۔ وہ بھی مر گیا اور یہ سلسلہ اولاد میں چلتا رہا بعد ازاں ان کی اولاد نے کہا: "ہمارے بڑوں نے یہ مجسّمے اسی لیے بنائے تھے کہ یہ معبود ہیں پس ان کی عبادت شروع کر دی۔"

بعض اصحاب علم کا خیال ہے کہ قوم نوح کے معبود دراصل ستارے تھے جن کی خیالی صورتیں بنا کر ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ اس پر تفصیلی گفتگو ہم مشرکین عرب کے تصوّر الٰہ کے ذکر میں کریں گے۔

قرآن مجید میں قوم عاد، قوم ثمود اور قوم شعیب کا بھی ذکر آیا ہے اور اس سے

---

[1] فتح الباری، الطبع الحلبی البابی بمصر ج ۱۰ ص ۲۹۵۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ قومیں بھی قوم نوح کی طرح شرک و بُت پرستی میں مبتلا تھیں۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ ان کے معبود بھی وہی رہے ہوں گے جو قوم نوح کے تھے ۔
قوم عاد کی بُت پرستی کا ذکر ایک جگہ ان لفظوں میں آیا ہے :

قَالُوْا یٰھُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَۃٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِکِیْٓ اٰلِھَتِنَا عَنْ قَوْلِکَ وَمَا نَحْنُ لَکَ بِمُؤْمِنِیْنَ ○ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىکَ بَعْضُ اٰلِھَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اُشْھِدُ اللّٰہَ وَاشْھَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ○ (ھود : ۵۳، ۵۴)

ان لوگوں نے کہا : اے ہود! تم نے ہمارے سامنے کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی اور ہم محض تمھارے کہنے سے اپنے معبودوں کو نہ چھوڑیں گے اور ہم کسی طرح بھی تمھاری بات ماننے والے نہیں۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار تم پر پڑی ہے۔ ہود نے کہا : میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم اللہ کے ساتھ شریک قرار دیتے ہو۔

قوم ابراہیم

حضرت ابراہیم بابل کے شہر "اُر" میں پیدا ہوئے اور پھر حران منتقل ہو گئے۔ ان دونوں مقامات پر جو قوم آباد تھی وہ صابئی[1] تھی اور ان کا مذہب ستارہ پرستی تھا۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ یہ لفظ عبرانی سے ماخوذ ہے جس کے معنی بپتسمہ لینے والے (Baptist) کے ہیں (لیڈن ۱۹۳۴ء ج ۴ ص ۲۱) لیکن مسلم علماء کی تحقیق یہ ہے کہ صابا عبری لفظ "صبع" کا آرامی تلفّظ ہے۔ صبع عربی لفظ "صبغ" کے ہم معنی ہے جس سے عربی میں دوسرا لفظ "اصطباغ" بنا ہے۔ اس کے اصل معنی نہانے اور دھونے کے ہیں اور اصطلاحاً بپتسمہ کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ چونکہ یہ فرقہ مذہبًا دن میں کئی مرتبہ غسل کرتا تھا اس لیے اس کا آرامی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں[1]:

"صائبین کا خاص مرکز حران تھا۔ حضرت ابراہیم یہیں پیدا ہوئے یا عراق سے یہاں آئے تھے، دونوں قول ہیں۔ یہاں علت اولیٰ، عقل اولیٰ اور نفس کلیہ کے ہیکل تھے نیز زحل، مشتری، مریخ، شمس، زہرہ، عطارد اور قمر کے ہیکل تھے۔"

صابئ معبود واحد پر ایمان رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ اعتقاد بھی تھا کہ ستارے اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ ہیں۔ وہ صبح کو طلوع آفتاب سے قبل تک، دوپہر میں عین زوال کے وقت اور شام میں ٹھیک غروب آفتاب کے وقت ان ستاروں کی پرستش کرتے تھے۔ ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ قطب شمالی جملہ ستاروں کا مرکز ہے۔ تمام اجرام سماویہ آغاز آفرینش سے برابر متحرک ہیں لیکن قطب تارا ہمیشہ ایک جگہ قائم رہتا ہے اسی لیے ان کی نماز کا قبلہ قطب شمالی تھا اور وہ اسی کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے اور مناجات کیا کرتے تھے[2]۔

صابئ یہ خیال کرتے تھے کہ تمام عالم ارواح سے پُر ہے اور ہر ستارہ ایک مخصوص روح کا مسکن ہے اور یہی ارواح عالم اسباب پر حکمراں ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

نام صابئ پڑا اور اسی سے عربی میں آیا۔ ایک دوسری تحقیق یہ ہے کہ سامی زبانوں میں صبا کا لفظ ستاروں کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ عبرانی میں اس کے معنی جماعت ستارگاں کے ہیں (ترجمۂ قرآن از سیل، مقدمہ) عربی میں صبا کے معنی ستارے کے طلوع ہونے اور نکلنے کے ہیں (لسان العرب لفظ صبا) چنانچہ قاضی بیضاوی نے صابئ کا اشتقاق اسی لفظ سے کیا ہے (دیکھیں ارض القرآن ج ۲ ص ۲۱۰)

[1] علامہ ابن تیمیہ، الرد علی المنطقیین بحوالہ ارض القرآن (مولانا سید سلیمان ندوی) دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۲۴ء طبع دوم ج ۲ ص ۲۰۳۔

[2] ارض القرآن ج ۲ ص ۲۰۱، مزید دیکھیں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لیڈن ۱۹۳۴ء ج ۴ ص ۲۱

آف اسلام کے مقالہ نگار نے شہرستانی کے حوالہ سے لکھا ہے[1]:

" وہ ایک خالق کا عقیدہ رکھتے تھے، ان کا یہ اعتقاد بھی تھا کہ یہ خالق عاقل و دانا اور مقدس ہے، اسے کسی نے پیدا نہیں کیا یعنی غیر مخلوق ہے، وہ ناقابل ادراک ہے، اس تک رسائی صرف ستاروں (روحوں) کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ یہ روحیں مادہ، عمل اور ہیئت کے اعتبار سے مقدس (Holy) ہیں اور رب اعلیٰ (Sovereign lord) کے پاس ان کے سفارشی (Inter cessors) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تزکیۂ روح (باطن) اور تطہیر جذبات کے ذریعہ ایک شخص ان سے تعلق قائم کر سکتا ہے۔ یہی پاک روحیں (ستارے) کائنات میں ہونے والے تمام تغیرات کی ذمہ دار ہیں۔ ہر روح کے ذمہ ایک مخصوص کام ہے مثلاً پانی برسانے کا کام ایک روح کے سپرد ہے (Master of Rain) اسی کے حکم سے ہوائیں چلتی ہیں، مناظر فطرت، طوفان اور زلزلوں پر اسی کی حکومت ہے۔"

آثار قدیمہ کی تحقیقات سے بھی ان کے مذکورہ عقائد کی تائید ہوتی ہے۔ بابل کے کھنڈروں میں جو تختیاں اور ہیکلوں پر کندہ کتبات ملے ہیں ان میں ان کے کوکبی معبودوں کے نام درج ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر ستارہ ایک رب تھا اور عالم کے ایک مخصوص حصّے پر بلا شرکت غیرے فرماں روا خیال کیا جاتا تھا۔ نیچے ہم ان کے چند معبودوں کے نام ان کی مفوّضہ حیثیت کے ساتھ درج کرتے ہیں جس سے ان کے اعتقاد کی حقیقت مزید واضح ہو گی[2،3]:

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۴ ص ۲۲ (لیڈن ۱۹۳۴ء)

[2] Layard, Nenwa and its Reminiscence, 1849.

[3] Discovery in the Reminiscence of Nenwa and Babylon, 1853.

بحوالہ ارض القرآن ج ۲ ص ۱۵۹)

ستارے کا نام	معبود کا نام	مقام و مرتبہ
شمس	شمس	یہ رب الارباب تھا
زہرہ	اشتار[1]	محبت اور حسن کی دیوی
مریخ	نرغل (یا نرگال)	لڑائی اور قہر کا دیوتا
مشتری	مرودک	روشنی کا دیوتا
عطارد	نبو	علم کا دیوتا
چاند	اینتو	خوش حالی کا دیوتا

ان معبودوں میں سب سے مشہور دیوتا سورج اور چاند تھے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے[2]:

"ابراہیم (علیہ السلام) "اُور" کے رہنے والے تھے جو قدیم عراق (سمیری) کا ایک شہر تھا۔ آثار قدیمہ کی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ان کی قوم ایک مشرک قوم تھی، ان کا مشہور دیوتا "ننا" (Nana) تھا یعنی چاند دیوتا۔ اس کے علاوہ دوسرے معبودوں (ستاروں) کی بھی پرستش کرتے تھے۔ قدیم عراق کے دوسرے شہروں میں بھی چاند دیوتا کی پرستش ہوتی تھی۔ شام کے علاقہ کنعان میں جہاں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) ہجرت کے بعد سکونت پذیر ہوئے تھے بعل دیوتا کی پرستش ہوتی تھی۔ یروشلم کے علاقے کا معبود ایل (El) تھا۔"

ابراہیم علیہ السلام کا پورا گھر کواکب پرستی میں مبتلا تھا، توراۃ کے سفر یوشع میں ہے[3]:

"تمہارے باپ دادا تارح[ع] (ابراہیم کے باپ) اور تاخور (دادا)

---

[1] برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ اشتار (ishtar) اہل بابل کی ارضی دیبی (Earth goddess) تھی۔ (دیکھیں ہسٹری آف ویسٹرن فلاسفی مطبوعہ ۱۹۵۰ء ص ۲۳)

[2] دی انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مائکروپیڈیا، مطبوعہ ۱۹۷۳ء ج ۱ ص ۱۳۔ [3] توراۃ ۲۴-۲

[ع] ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آذر تھا جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے: وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ الآية

قدیم زمانے میں نہر (فرات) کے پار رہتے تھے اور غیر معبودوں کی پرستش کرتے تھے"

قرآن مجید میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تلاش حق کا ذکر ہے اس سے بھی اس عہد کے مذہبی تصوّرات (کواکب پرستی) پر واضح روشنی پڑتی ہے :

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ج قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ج فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ج فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ج فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

(انعام: ٦ - ٧٩)

جب رات نے اس کو ڈھانپ لیا (یعنی تاریکی پھیل گئی) تو اس نے ایک ستارہ دیکھا، کہا: یہ میرا رب ہے، جب وہ غروب ہوگیا تو کہا: میں غروب ہونے والوں کو محبوب نہیں رکھتا، پھر جب چاند کو تاباں دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے، جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا: اگر میرے رب نے میری رہبری نہ فرمائی تو میں گمراہ لوگوں میں سے ہو جاؤں گا۔ پھر جب سورج کو تابناک دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے، جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا: اے قوم کے لوگو! میں ان (معبودوں کی پرستش) سے بری ہوں جن کو تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے اپنا رخ ہر طرف سے موڑ کر اس ذات کی طرف پھیر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ صائبیوں کا ربّ الارباب سورج تھا (هٰذَا رَبِّيْ، هٰذَآ اَكْبَرُ) اس کے بعد چاند اور دوسرے ستاروں کا درجہ تھا۔ ان کے بڑے معبد

میں ان تمام ستاروں کے ہیکل بنے ہوئے تھے اور ان کی پوجا ہوتی تھی۔ خلیل بت شکن کے ذکر میں ایک جگہ ہے:

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنتُمْ لَهَا
عَاكِفُونَ ۝ قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ۝ قَالَ لَقَدْ
كُنتُمْ أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ قَالُوا أَجِئْتَنَا
بِالْحَقِّ أَمْ أَنتَ مِنَ اللَّاعِبِينَ ۝ قَالَ بَل رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَ
الْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ وَأَنَا عَلَىٰ ذَٰلِكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ ۝
وَتَاللَّهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُم بَعْدَ أَن تُوَلُّوا مُدْبِرِينَ ۝
فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا إِلَّا كَبِيرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ ۝
قَالُوا مَن فَعَلَ هَٰذَا بِآلِهَتِنَا إِنَّهُ لَمِنَ الظَّالِمِينَ ۝ قَالُوا سَمِعْنَا
فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ إِبْرَاهِيمُ ۝ قَالُوا فَأْتُوا بِهِ عَلَىٰ أَعْيُنِ
النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُونَ ۝ قَالُوا أَأَنتَ فَعَلْتَ هَٰذَا بِآلِهَتِنَا
يَا إِبْرَاهِيمُ ۝ قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَٰذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِن
كَانُوا يَنطِقُونَ ۝ فَرَجَعُوا إِلَىٰ أَنفُسِهِمْ فَقَالُوا إِنَّكُمْ أَنتُمُ
الظَّالِمُونَ ۝ ثُمَّ نُكِسُوا عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هَٰؤُلَاءِ
يَنطِقُونَ ۝ قَالَ أَفَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُكُمْ شَيْئًا
وَلَا يَضُرُّكُمْ ۝ أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ أَفَلَا
تَعْقِلُونَ ۝ (انبیاء: ۵۲-۶۷)

جب ابراہیم نے اپنے باپ اور قوم کے لوگوں سے کہا: یہ مورتیاں کیا ہیں جن کی پرستش میں تم لگے ہوئے ہو؟ انھوں نے جواباً کہا: ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے۔ ابراہیم نے کہا: بے شک تم اور تمھارے باپ دادا کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔ انھوں نے کہا: کیا تم یہ بات سچ مچ کہہ رہے ہو یا محض ہنسی مذاق کر رہے ہو؟ ابراہیم نے کہا: نہیں میں مذاق نہیں کر رہا

ہوں) فی الواقع تمھارا (حقیقی) رب (جولائق عبادت ہے) وہ ہے جو تمام آسمانوں اور زمین کا رب ہے، جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور اس بات کی گواہی دینے والوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ اور اللہ کی قسم میں تمھارے ان اصنام کے خلاف ضرور ایک چال چلوں گا جب تم ان کے پاس سے جا چکے ہو گے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور ان کے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا بجز ان کے ایک بڑے بت کے، شاید کہ وہ اس کی طرف (دریافت احوال کے لیے) رجوع کریں۔ انھوں نے (جب ٹوٹے ہوئے بت دیکھے تو غصے میں) کہا: ہمارے بتوں کے ساتھ یہ حرکت جس نے کی ہے؟ یقیناً وہ سخت خطاکار ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ہم نے ایک نوجوان کو جس کا نام ابراہیم ہے، ان بتوں کا ذکر (برے انداز میں) کرتے ہوئے سنا ہے۔ انھوں نے کہا: اس کو پکڑ لاؤ اور لوگوں کے سامنے حاضر کرو تاکہ وہ بچشم خود دیکھ سکیں (کہ کس نے ان کے بتوں کے ساتھ یہ نازیبا حرکت کی ہے) انھوں نے کہا: اے ابراہیم! کیا تم نے ہمارے بتوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟ ابراہیم نے کہا: نہیں بلکہ اس بڑے (بت) نے یہ حرکت کی ہے، انہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں (ابراہیم کے اس جواب پر) وہ اپنے جی میں سوچنے لگے اور کہا کہ بلاشبہ تم لوگ ناحق پر ہو۔ پھر (شرمسار ہو کر) انھوں نے اپنے سروں کو جھکا لیا (اور بولے) اے ابراہیم تم خوب جانتے ہو کہ یہ اصنام قوت نطق نہیں رکھتے۔ ابراہیم نے کہا: کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسوں کی عبادت کرتے ہو جو نہ تم کو کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان، تف ہے تم پر اور ان پر بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ کیا تم ذرا بھی عقل سے کام نہیں لیتے۔

قوم مجوس

قرآن مجید میں قوم مجوس[1] کا ذکر صرف ایک جگہ سورۂ حج میں آیا ہے ، فرمایا گیا :

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕیْنَ وَالنَّصٰرٰی وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْاۤ ۖۗ اِنَّ اللّٰهَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝ (حج : ۱۷)

بے شک اہل ایمان (مسلمان) یہود، صابئین، نصاریٰ، مجوس اور مشرکین، ان سب کے درمیان قیامت کے دن (ان کے مذہبی اختلافات کا) اللہ فیصلہ کردے گا، بے شک اللہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

اس آیت میں مجوس کا لفظ جمع ہے اس کی واحد مجوسی ہے[2] یہ یونانی زبان کا لفظ

---

[1] قوم مجوس کے اہل کتاب ہونے کے بارے میں اختلاف ہے امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ کسی حقیقی پیغمبر کے پیرو نہ تھے بلکہ متنبی کے پیرو تھے اس لیے ان کا شمار نہ اہل کتاب میں ہوگا اور نہ مشرکین میں بلکہ ان کو درمیانی درجے میں رکھا جائے گا۔ لیکن دیگر علماء نے ان کو اہل کتاب میں شمار کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کے زرتشتیوں سے جزیہ قبول کیا تھا۔ حضرت عمر فاروق کے زمانے میں جب ان کے بارے میں اختلاف واقع ہوا کہ انھیں اہل کتاب سمجھا جائے یا مشرک تو عبدالرحمٰن بن عوف کی بیان کردہ حدیث کی بنیاد پر انھیں اہل کتاب قرار دیا گیا۔
(عن بجالۃ التمیمی قال لم یرد عمر ان یاخذ الجزیۃ من المجوس حتی شهد عبد الرحمٰن بن عوف ان رسول اللہ اخذها من مجوس هجر — مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۱۹۴) مزید دیکھیں صحیح بخاری، قاہرہ ۱۳۰۴ھ ج ۲ ص ۱۴۴

[2] المجوس جیل معروف جمع، واحدهم مجوسی "مجوس ایک معروف قوم ہے، یہ لفظ جمع ہے اس کا واحد مجوسی ہے" (لسان العرب)

ہے۔ گمان غالب ہے کہ یونانیوں نے قدیم فارسی کے لفظ مغوش (جدید فارسی میں مغ کہتے ہیں) سے میجوس بنالیا اور یہی لفظ عربی میں آکر مجوس ہوگیا۔

لیکن بعض اہل علم کا خیال ہے کہ مجوس منج کوش (Manj Kosh) سے ماخوذ ہے[1] عربی میں اس کا مترادف صاغر الاذنین (چھوٹے کان والا) ہے۔ منج کوش ایک شخص کا نام تھا جو زرتشت سے پہلے گذرا تھا اور اسی شخص نے مذہب ساحران (Religion of Magicians) کی بنیاد رکھی اور زرتشت کے زمانہ میں اسی فرقہ نے زرتشتی مذہب قبول کرلیا[2]۔ عہد حاضر میں اس مذہب کے حاملین پارسی کہلاتے ہیں۔

---

[1] ابن منظور نے لکھا ہے:

وھو معرب " منج کوش " وکان رجلا صغیر الاذنین کان اول من دان بدین المجوس ودعا الناس الیھا فعربتہ العرب (لسان العرب، بذیل مادہ مجوس۔

"یہ اس کلمہ کی عربی شکل ہے اور اس کی اصل "منج کوش" ہے۔ یہ ایک آدمی تھا جس کے کان چھوٹے تھے۔ یہ پہلا شخص تھا جو مجوسی مذہب میں داخل ہوا اور اس کی طرف لوگوں کو بلایا۔ عرب نے اسی لفظ کو عربی بنالیا۔"

[2] مجوسیوں نے زرتشتی مذہب قبول تو کرلیا لیکن وہ اپنے قدیم عقائد اور رسوم ورواج سے کبھی دست بردار نہیں ہوئے۔ انھوں نے بتدریج نہایت چالاکی سے مذہب زرتشت میں غیر توحیدی تعلیمات کو داخل کردیا اور امتداد زمانہ کے ساتھ ان کے عقائد نے غلبہ حاصل کرلیا۔ آتش پرستی جس کے لیے قدیم ایران کے آتش کدے مشہور تھے، مجوسیوں ہی کی ایجاد ہے۔ پارسی آج بھی اس کی تعظیم وعبادت کرتے ہیں۔ محمد بن جریر طبری لکھتے ہیں: المجوس الذین عظموا النیران وخدموھا "مجوسی ان کو کہتے ہیں جو آگ کو قابل تعظیم مانتے ہیں اور اس کی خدمت کرتے ہیں" (دیکھیں، تفسیر طبری سورۂ حج آیت ۱۷)

مجوسیوں کا علاقہ میڈیا (مغربی ایران) تھا اسی جگہ زرتشت کی پیدائش ہوئی۔ زرتشت کے بارے میں تاریخی طور پر بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ چھٹی صدی قبل مسیح میں سکندر اعظم سے ۲۵۸ سال قبل گذرا ہے۔ ابتدا میں اس کو زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن جب بادشاہ وقت وشتاسپ (Vishtasp) نے اس کے مذہب کو قبول کرلیا تو اسے بہت زیادہ فروغ ملا۔

زرتشت کے باب میں اکثر اہلِ علم کی رائے ہے کہ وہ توحید کا علم بردار تھا۔ اس مذہب میں خداوند اعلیٰ کا نام اہورا مزدا[1] (رب عاقل) ہے۔ زرتشت نے اسی خداوند اعلیٰ کی عبادت کی تبلیغ و تلقین کی۔ گاتھا[2] کے بیان کے مطابق یہی ہستی زمین

---

[1] بعض کتابوں میں آہورمزد لکھا ہے۔

[2] زرتشت کی مذہبی کتاب کا نام "اوستا" ہے۔ مشہور ہے کہ اردشیر بابکان کے حکم سے اوستا کو جمع کرکے اسے مرتب کیا گیا۔ اس وقت جو اوستا ملتی ہے اس پر کافی طویل عرصہ گذر چکا ہے اور اس میں کئی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ گاتھا یا مقدس نغمے جو اوستا کی کتاب یسنا کے اجزاء ہیں، اپنی ترکیب و انداز بیان کے لحاظ سے قدیم ترین حصّے ہیں اور ممکن ہے کہ خود زرتشت کے کہے ہوئے ہوں۔

تاریخی روایات کے مطابق اصل اوستا موجودہ اوستا سے کہیں زیادہ ضخیم تھی۔ موجودہ اوستا میں پانچ کتابیں ہیں: یسنا، ویسپرد، وندیداد، یشت اور خردہ اوستا۔ ان سب میں خدائے بزرگ آہورمزد، ایزداں اور فرشتوں کی حمد و ثنا، پاکی، سچائی، نکوکاری اور سعی و عمل کی تعریف، اہرمن، جھوٹ، خیانت، اور فریب کی برائی بیان ہوئی ہے، اسی طرح ان میں مذہبی احکام و اذکار درج ہیں، کچھ حصّوں میں تاریخی داستانیں اور روایتیں پیش کی گئی ہیں (دیکھیں تاریخ ادبیات ایران، ڈاکٹر رضا زادہ شفیق، مترجم سید مبارز الدین رفعت (عثمانیہ) حیدرآباد دکن۔ مطبوعہ ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی، بار ہشتم ۱۹۸۲ء ص ۳۰)

اور آسمان اور دوسری تمام مادی وغیر مادی اشیاء کی خالق ہے۔ وہی روشنی اور تاریکی کی گردش کا ذریعہ ہے، وہی مقتدرِ اعلیٰ اور قانون ساز ہے اور وہی تمام کائنات کا منصف ہے۔

لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ زرتشت کی توحیدی تعلیمات میں شرک داخل ہوگیا۔ اگرچہ گاتھا میں کسی دیوی کا ذکر نہیں ہے جو اہورا مزدا کے کاموں میں شریک ہو لیکن یہ ضرور لکھا ہوا ہے کہ اہورا مزدا کو چھ یا سات ہستیاں گھیرے رہتی ہیں جن کا نام امست اسپنٹاس (Amesth Spentas) ہے جس کا مطلب نافع اور فانی وجود ہے۔ گاتھا میں یہ نام کثرت سے آیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اہورا مزدا ان سات ہستیوں میں سے چار کا باپ ہے۔

گاتھا میں واضح طور پر ثنویت (Dualism) کا تصوّر موجود ہے یعنی یہ کہ خیر و شر کی دو قوتیں یا روحیں اس کائنات میں کارفرما ہیں۔ خیر کی قوت کا نام یزداں اور شر کی قوت کا نام اہرمن ہے۔ ان دونوں قوتوں کا خالق اہورا مزدا ہے اور اسی کی مرضی سے یہ دونوں قوتیں برسرِ پیکار ہیں اور آخر میں "عاقل رب" (امست اسپنٹاس) کی مدد سے شر کی قوت کو مغلوب کرلے گا اور اس طرح کائناتی اور اخلاقی ثنویت جو اس وقت موجود ہے اس کا خاتمہ ہوجائے گا۔

انسان کو اس امر کی آزادی دی گئی ہے کہ وہ ان دونوں قوتوں میں سے جس قوت کا چاہے ساتھ دے خواہ شر کا خواہ خیر کا اور اسی پر اس کی تقدیر کا فیصلہ ہے۔ اگر وہ خیر کی قوت کا ساتھ دیتا ہے اور اچھّے عمل کرتا ہے تو اسے سرمدی زندگی ملے گی اور اگر وہ شر کا ساتھ دیتا ہے اور بُرے اعمال کرتا ہے تو اس کا ضمیر خود اس کو سزا دے گا اور اہورا مزدا بھی اسے سزا دے گا اور وہ اس طرح کہ اسے ادنیٰ مخلوق بنا کر رکھے گا۔[1]

---

[1] Encyclopaedia Britannica Macropaedia .15th.Ed. 1973, Vol. 19, pp.1169, 1170.

اس سلسلے میں علامہ شہرستانی کا بیان بھی قابل ملاحظہ ہے، لکھتے ہیں[1]:

"مجوسی حنیفی کے بالمقابل ہیں۔ یہ ثنویت کے علم بردار تھے یعنی ان کا خیال تھا کہ خدا دو ہیں، نور اور ظلمت اور یہی عالم میں خیر و شر، نفع و ضرر اور اصلاح و فساد کے ذمہ دار ہیں (فارسی میں ان کو یزداں و اہرمن کہتے ہیں) ان کا کہنا ہے کہ جب نور ظلمت کے ساتھ ممزوج ہوا تو عالم پیدا ہوا اور نور کا ظلمت سے خلاصی پانا ہی معاد ہے۔ نور کو وہ قدیم اور ظلمت کو حادث مانتے ہیں البتہ اس کے حدوث میں اختلاف ہے۔ اگر یہ نور سے نکلا ہے تو یہ ممکن نہیں کیونکہ نور سے ظلمت (شر) کا حدوث ممکن نہیں ہے۔ بہرحال وہ یزداں کو ازلی اور اہرمن کو حادث مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یزداں نے سوچا ہوگا کہ اگر اس کا منازع (مخالف) پیدا ہو تو وہ کیسا ہوگا (حالانکہ نور کی طبیعت سے اس طرح کی فکر ردی کا تصور بھی بعید ہے) چنانچہ اس نے ظلمت کو خلق کیا اور اس کا نام اہرمن رکھا اور اس کی فطرت میں شر، فتنہ و فساد اور ضرر و اضرار رکھا۔ انجام کار لشکر نور اور لشکرِ ظلمت میں جنگ چھڑ گئی پھر ملائکہ نے بیچ میں پڑ کر اس بات پر صلح کرادی کہ عالم سفلی خالصاً اہرمن کے لیے ہے اور یہی حدوث عالم کا سبب ہے"[2]

---

[1] الملل والنحل للشہرستانی (الجزء الثانی) برحاشیہ الملل والنحل لابن حزم، الجزء الثانی ص ٥٧-٦٠

[2] علامہ شہرستانی کا یہ بیان انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے بیان سے جسے ہم اس سے پہلے نقل کر چکے ہیں، بڑی حد تک مختلف ہے۔ راقم کے نزدیک انسائیکلوپیڈیا کا بیان زیادہ قرین صواب ہے۔ شہرستانی نے اہورامزدا کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ سب کے نزدیک یہ متفق علیہ ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اہل تحقیق کے مذکورہ بیانات سے بالکل ظاہر ہے کہ مجوسیوں نے خیر و شر یا نور و ظلمت کو دو مستقل خداؤں کا درجہ دے رکھا تھا۔ قرآن مجید کی درج ذیل آیات میں غالباً ان کے اس مشرکانہ خیال کی تردید کی گئی ہے، ارشاد ہوا:

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ○ (نحل: ۵۱)

اور اللہ نے فرمایا کہ دو معبود نہ بناؤ، بے شک وہی ایک تنہا معبود ہے، پس تم لوگ مجھ ہی سے ڈرا کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۬ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ○ (انعام: ۱)

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا اور تاریکیوں اور نور کو پیدا کیا۔ اس کے باوجود اہل کفر دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر قرار دیتے ہیں۔

قوم فرعون

مصری تاریخ کے علاوہ خود قرآن مجید کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصری قوم اسی نوعیت کے شرک میں مبتلا تھی جس میں اس سے پہلے کی قومیں مبتلا رہ چکی تھیں یعنی متفرق ارباب کی پرستش۔ حضرت یوسف[1] علیہ السلام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کہ وہ مذہب زرتشت کا خداوند اعلیٰ تھا اور خیر و شر (یزداں و اہرمن) کی قوتوں کا خالق بھی۔ علامہ شہرستانی کے بیان کے مطابق مجوسیوں کے بہت سے فرقے تھے جن میں زردشتی ثنوی، مانوی، اور مزدکی زیادہ مشہور ہیں۔ (دیکھیں، الملل والنحل الجزء الثانی برحاشیہ ص ۶۰ - ۷۱۔

[1] تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام بیسویں صدی قبل مسیح میں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کا ذکر قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ انھوں نے قید خانے میں اپنے دو ساتھی قیدیوں کے سامنے جو تقریر کی اس سے اس عہد کے مصریوں کے مذہبی عقائد پر واضح روشنی پڑتی ہے، فرمایا:

مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ○ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهٖ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَّا أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○ (یوسف: ۳۸-۴۰)

ہم کو کسی طرح یہ زیب نہیں دیتا کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک قرار دیں۔ یہ ہم پر اور دوسرے لوگوں پر اللہ کا ایک فضل ہے لیکن اکثر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ اے قید خانہ کے میرے دونوں رفیقو! متفرق معبود اچھے ہیں یا ایک اللہ جو سب سے زبردست ہے؟ تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بس نام ہیں جن کو تم نے اور تمھارے آبا و اجداد نے گھڑ لیے ہیں۔ اللہ نے تو اس کی کوئی دلیل بھیجی نہیں۔ حکم تو بس اللہ کا ہے۔ اس نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ یہی سیدھا طریقۂ زندگی ہے لیکن اکثر انسان اسے نہیں جانتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

مصر پہنچے تھے۔ اس وقت وہاں جو قوم حکمراں تھی وہ تاریخ میں چرواہے بادشاہ (Hyksos Kings) کے نام سے معروف ہے۔ یہ لوگ عربی النسل تھے اور باہر سے آکر وہاں کی حکومت پر قابض ہو گئے تھے۔ یہ خاندان پانچ سو ۵۰۰ سال تک مصر پر حکمراں رہا۔ اس کے بعد ملکی حکومت قائم ہوئی یعنی حکومت فراعنہ۔

موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں بھی مصری قوم پہلے کی طرح " اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ " کی پرستش میں مشغول تھی۔ ایک نبطی کے قتل کی پاداش میں جب فرعون[1] مصر نے موسیٰ علیہ السّلام کے قتل کا حکم صادر کیا تو اس کے ایک درباری نے اس فیصلہ کی مخالفت کی۔ یہ مردِ مومن تھا لیکن اپنے ایمان کو مخفی رکھے ہوئے تھا۔ اس نے مخالفت میں جو تقریر کی اس سے مصری قوم کے شرک کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ اعیانِ فرعون کو خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا:

وَيٰقَوْمِ مَالِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ○ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ○

(مومن : ۴۱، ۴۲)

اے میری قوم! یہ کیا بات ہے کہ میں تو تمھیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم لوگ مجھے دوزخ کی طرف بلاتے ہو، تم مجھے اس بات کی دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ کا انکار کردوں اور اس کے ساتھ ان ہستیوں کو شریک ٹھہراؤں جن کا مجھے علم نہیں اور میں تمھیں اس ہستی کی طرف بلاتا ہوں جو نہایت زبردست اور معاف کرنے والی ہے۔

---

[1] چرواہے بادشاہوں کے بعد جس مصری خاندان کو حکومت ملی اس کے فرماں روا فرعون کہلائے۔ یہ اُن کا لقب تھا۔ فرعون کے لفظی معنی سورج دیوتا کی اولاد کے ہیں۔ اس لقب کے ذریعہ فراعنۂ مصر یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ سورج دیوتا کے نمایندے کی حیثیت سے حکمراں ہیں تاکہ مصری عوام بے چون وچرا ان کے تابع فرمان رہیں کیونکہ سورج دیوتا کے نمایندے کے خلاف بغاوت کا تصوّر بھی محال تھا۔

موسیٰ علیہ السّلام کے عہد میں جو فرعون فرماں روا تھا اس کا نام مرنفتاح (Merneptah) تھا۔ یہ رعمسیس دوم کا فرزند تھا۔

قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی اس صف میں خود فرعون (فرماں روائے مصر) بھی شامل تھا مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○

(قصص : ۳۸)

اور فرعون نے کہا: اے اہل دربار میں اپنے علاوہ کسی دوسرے کو تمہارا الٰہ نہیں جانتا، اے ہامان تم ہمارے لیے پختہ اینٹیں تیار کراؤ اور پھر ان سے میرے لیے ایک بلند عمارت بناؤ تاکہ میں (اس پر چڑھ کر) موسیٰ کے الٰہ کی کھوج خبر لوں، اور میں تو (اس بات میں کہ میرے سوا کوئی اور الٰہ ہے) موسیٰ کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔

دوسری جگہ ہے:

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ○ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ○ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ○ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ○ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ○

(شعراء : ۲۳ - ۲۹)

فرعون نے کہا: ربّ العالمین کیا چیز ہے؟ موسیٰ نے کہا: آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے ان سب کا رب (مراد) ہے بشرطیکہ تم یقین کرنے والے بنو۔ فرعون نے اپنے اردگرد والوں سے کہا: تم لوگوں نے کچھ سنا نہیں (یہ کیا بکتا ہے) موسیٰ نے کہا: وہ تمہارا اور تمہارے آباواجداد

کا بھی رب ہے۔ فرعون نے کہا: بے شک تمھارا رسول جو (اس کے قول
کے مطابق) تمھاری طرف بھیجا گیا ہے بالکل مجنوں ہے۔ موسیٰ نے کہا:
وہ مشرق اور مغرب اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ان سب کا رب ہے
بشرطیکہ تم عقل سے کام لو۔ فرعون نے کہا: اگر تم نے میرے سوا کسی اور
کو الٰہ بنایا تو میں تمھیں قید کر دوں گا۔

ایک اور جگہ ہے:

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ○ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ○ فَحَشَرَ فَنَادٰى ○
فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ○ (النّٰزعٰت: ۲۱، ۲۴)

پس فرعون نے تکذیب کی اور (تمام معجزات کا جو اس کی طرف بھیجے گئے)
انکار کیا، پھر (موسیٰ سے) الگ ہو کر (اس کے خلاف) تگ و دو کرنے
لگا، اور (لوگوں کو) جمع کیا اور (ان کے سامنے) تقریر کی اور کہا کہ میں
تمھارا "رب اعلیٰ" ہوں۔

مذکورہ آیات سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ فرعون خود کو الٰہ اور رب سمجھتا تھا اور مصری قوم بھی یہی خیال رکھتی تھی۔ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ خود کو حقیقی معنوں میں الٰہ اور ربِ اعلیٰ سمجھتا تھا۔ ہمارے اکثر مفسّرین کا یہی خیال ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ دعوائے الوہیت براہِ راست نہ تھا بلکہ بالواسطہ تھا۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ دیگر سامی قوموں کی طرح مصر میں بھی کواکب پرستی رائج تھی۔ ہر شہر کا ایک الگ دیوتا ہوتا تھا۔ پورے ملک میں ۱۹ دیوتا اور ۱۱ دیویاں بڑی تھیں، چھوٹے دیوتا اور دیویاں بے شمار تھے۔ ان کا سب سے بڑا دیوتا آفتاب تھا جس کا نام ان کی زبان میں رَعْ تھا۔ ان کے دارالحکومت کا نام مدینۃ الشمس تھا جس کو مصری "ان" کہتے تھے۔ اسی شہر میں آفتاب دیوتا کا مندر تھا۔ بادشاہ آفتاب دیوتا کا بیٹا سمجھا جاتا تھا اسی لیے اس کا لقب رعمسیس تھا یعنی

ابن الشمس[1]۔ یہی وہ نسبی تعلق تھا جس کی بنیاد پر سلاطین مصر (فراعنہ) خود کو الٰہ اور رب کہتے تھے۔

جب موسیٰ علیہ السلام پیغام حق لے کر فرعون، فرماں روائے مصر کے پاس گئے اور کہا کہ میں رب العٰلمین کا فرستادہ ہوں تو اس نے جیسا کہ مذکورہ آیات میں ہے، پوچھا: مَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی سارے جہاں کے رب سے تمھاری کیا مراد ہے؟ اس سوال کے پوچھنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو جس آسمانی ربّ الارباب یعنی آفتاب کا بیٹا اور اس کا نمائندہ سمجھتا تھا اس کا نام موسیٰ علیہ السلام نے نہیں لیا بلکہ ربُّ العلمین کہا اس لیے وہ کشمکش و پنج میں پڑ گیا کہ اس سے کون سا رب مراد ہے۔ لیکن جب موسیٰ علیہ السلام نے اس کے سوال کے جواب میں کہا کہ وہ جس ہستی کے نمائندہ بن کر آئے ہیں وہ آسمانوں اور زمین دونوں کا رب ہے تو فرعون سمجھ گیا کہ یہ رب نہ آفتاب ہے اور نہ سلطانِ مصر اور موسیٰ کو دونوں کی ربوبیت سے انکار ہے۔ چنانچہ اس نے غصّہ میں موسیٰ علیہ السلام کو مجنوں کہا اور دھمکی دی کہ انھوں نے اس کے علاوہ کسی اور کو الٰہ مانا تو وہ انھیں قیدخانے میں ڈال دے گا۔

فی الواقع قوم فرعون نہ صرف آفتاب اور دیگر ستاروں کی پرستش کرتی تھی بلکہ فراعنۂ مصر کو بھی آفتاب سے نسبی تعلق کی بنا پر مستحق پرستش سمجھتی تھی اور ان کے سامنے مراسمِ عبودیت بجالاتی تھی۔

قوم موسیٰ

یہودی قوم ایک نہایت سرکش اور نافرمان قوم تھی اور اب بھی ہے۔ اسی لیے تاریخ کے مختلف ادوار میں اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانیوں کی انھیں سخت ترین سزائیں دیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی اللہ کو ایک جابر و قاہر اور سنگ دل

---

[1] ارض القرآن ج ۲ ص ۱۵۹، ۱۶۰

بادشاہ خیال کرتے تھے اور اس سے کسی قسم کے خیر و عدل کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ قرآن مجید میں ان کا یہ گستاخانہ قول نقل ہوا ہے: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (مائدہ: ٦٤) "وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔"

تورات اور قرآن مجید دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تصوّرِ الٰہ تمام تر مادّی تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ مطلق العنان اور جابر دنیوی بادشاہوں کی طرح ارض وسما کے تخت پر بیٹھا اپنی مخلوقات پر حکومت کر رہا ہے۔ اس مادّی تصوّرِ الٰہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ اپنی تاریخ کے تقریباً ہر دور میں اصنام پرستی میں مبتلا ہوئے بغیر نہ رہے۔ حتیٰ کہ جب وہ موسیٰ علیہ السلام کی معیت میں بحر قلزم کو عبور کر کے صحرائے سینا میں پہنچے تو وہاں انھوں نے بُت پرستوں کی ایک جماعت کو مصروفِ عبادت دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام سے ایک ارضی الٰہ کی مانگ کی جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ بیان ہوا ہے:

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ○ (اعراف: ۱۳۸)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتار دیا پس ان لوگوں کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں سے لگے بیٹھے (یعنی مصروف عبادت) تھے۔ انھوں نے کہا کہ اے موسیٰ ہمارے لیے بھی ایک ایسا ہی معبود (مجسّم) مقرر کر دیجیے جیسے ان کے یہ معبود ہیں۔ موسیٰ نے کہا: فی الواقع تم سخت جاہل لوگ ہو۔

موسیٰ علیہ السلام کے جواب سے ان کو تشفّی نہ ہوئی چنانچہ جب وہ اللہ کے حکم کے مطابق کوہ طور پر تشریف لے گئے اور ان کی جگہ ان کے بھائی ہارون علیہ السلام ان کے خلیفہ مقرر ہوئے تو ان لوگوں نے ایک شخص سامری کے دام فریب میں آ کر ایک بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ اس گوسالہ پرستی کا ذکر قرآن مجید

میں ایک سے زیادہ مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰی مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ○ (اعراف: ۱۴۸)

اور موسیٰ کی قوم نے اس کے (کوہ طور پر چلے جانے کے) بعد اپنے زیوروں سے ایک مجسّم بچھڑا بنالیا اور اس سے ایک قسم کی آواز نکلتی تھی۔ کیا انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ نہ ان سے بات کرتا تھا اور نہ ان کی رہنمائی کرتا تھا (لیکن اس کے باوجود) انھوں نے اس کو معبود بنالیا اور وہ یقیناً ظالم تھے۔

یہودیوں کی اس بُت پرستانہ ذہنیت کا ثبوت آج بھی تورات کے صفحات میں موجود ہے، کتاب یسعیاہ میں ایک جگہ ہے[۱]:

"وہ اہلِ مشرق کے رسوم سے پُر ہیں اور فلیتوں کی مانند شگون لیتے ہیں . . . . اور ان کی سرزمین بتوں سے بھی پُر ہے۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں کی صنعت یعنی اپنی ہی انگلیوں کی کاریگری کو سجدہ کرتے ہیں"

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ یہودیوں کا تصوّر الٰہ خالص مادی اور مشرکانہ تھا اور اس میں اصنام پرستی کا عنصر غالب حیثیت رکھتا تھا[۲]

قوم عیسیٰ

یہودیوں کے تصوّر الٰہ کے برعکس عیسائیوں کے تصوّر الٰہ میں رحمت و شفقت

---

۱ یسعیاہ، باب ۲: ۶ — ۸

۲ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان میں توحید کا سرے سے فقدان تھا۔ بے شک ان میں سچے موحّد بھی تھے لیکن ان کی بڑی تعداد برابر اصنام پرستی میں مبتلا رہی ہے، کچھ تو غیر مادی تصوّر الٰہ کی وجہ سے اور کچھ بُت پرست ہمسایہ قوموں کے زیر اثر۔

کا عنصر نمایاں تھا چنانچہ ان کا الٰہ ایک رحم دل بادشاہ تھا اتنا رحم دل کہ اس نے انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے بقول ان کے اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو مصلوب کرا دیا اور اب انسان خواہ کتنے ہی گناہ کرلے کچھ فرق نہیں پڑتا بشرطیکہ وہ اس کے بیٹے پر ایمان رکھتا ہو۔

عیسائیوں کے تصوّر الٰہ میں شرک کی پوری پوری آمیزش ملتی ہے۔ یہودی تعدّد الٰہ کے قائل نہ تھے، وہ ایک ہی الٰہ کو مانتے تھے البتہ اس کی عبادت وہ مختلف مادی صورتوں میں کرتے تھے۔ ان کا ذہن غیر مادی الٰہ کے تصوّر سے قاصر تھا۔ ان کے دل و دماغ کو اسی وقت تسکین ملتی تھی جب وہ اللہ کو مجازی لباس پہنا لیتے تھے۔ لیکن عیسائیوں کا شرک تعدّد الٰہ کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ اس معاملے میں عیسائیوں کے متعدد فرقے تھے۔ علامہ شہرستانی کے بیان کے مطابق ان کے ۷۲ فرقے تھے جن میں سے تین زیادہ مشہور ہوئے یعنی ملکائیہ، یعقوبیہ، اور نسطوریہ، پھر ان میں سے چند مزید فرقے نکلے۔ ہم یہاں ان کے مشہور فرقوں کے تصوّر الٰہ کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

ملکائیہ:

ان کا خیال تھا کہ کلمہ اور جسد بالکل متحد ہیں اور یہ اختلاط و اتحاد بالکل اس طرح کا ہے جس طرح دودھ پانی میں مخلوط و متحد ہوتا ہے۔ یہ تثلیث کے قائل تھے اور یہی عیسائیوں کا موجودہ مذہب ہے۔ کلمہ سے وہ اقنوم علم اور روح القدس سے اقنوم حیات مراد لیتے تھے[1]

---

[1] الملل والنحل للشہرستانی، الجزء الثانی برحاشیہ الملل والنحل لابن حزم الجزء الثانی ص۳۵۔ مزید دیکھیں، حقیقۃ مذہب الاتحادیین، امام ابن تیمیہ ص۲۴

یعقوبیہ (جیکو بائٹ)

یہ بھی اقانیم ثلاثہ کے قائل تھے البتہ ان کا خیال تھا کہ کلمہ خون اور گوشت میں تبدیل ہو کر الٰہ ہو گیا اور وہی مسیح ہے گویا مسیح کا جسم مظہر الٰہ ہے۔

ان میں کچھ ایسے بھی تھے جن کا خیال تھا کہ مسیح ہی اللہ ہے اور بعض کہتے تھے کہ لاہوت ناسوت کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس طرح ناسوت مسیح مظہر حق ہوا لیکن بطریق حلول نہیں کہ ایک جزء دوسرے جزء میں حلول کیے ہوئے ہو اور نہ بطریق اتحاد کلمہ جو صفت کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ یہ اس طور پر ہے جیسے فرشتہ انسان کی صورت میں ظاہر ہو یا شیطان حیوان کی شکل میں۔ اس جزوی اختلاف سے قطع نظر اس فرقے کی اکثریت کا یہ عقیدہ تھا کہ مسیح جوہر واحد (اقنوم واحد) ہے اگرچہ فی الاصل دو جوہر ہیں۔ ایک جوہر الٰہ جو قدیم ہے اور دوسرا جوہر انسان جو محدث ہے اور ان کی ترکیب نفس و بدن کی ترکیب کی طرح ہے اور بایں طور وہ جوہر واحد بن گیا۔ وہ پورا الٰہ اور پورا انسان ہے پس کہا جائے گا کہ انسان الٰہ ہو گیا یہ نہیں کہ الٰہ انسان ہو گیا[1]

مذکورہ دونوں فرقوں (ملکانیہ و یعقوبیہ) کا اس بات پر اتفاق تھا کہ مسیح مریم سے پیدا ہوئے اور اس پر بھی اتفاق تھا کہ وہ مقتول و مصلوب ہوئے البتہ کیفیت تولید و تصلیب اور کلمہ و جسد میں اتحاد کی نوعیت کے بارے میں ان میں اختلاف تھا۔[2]

نسطوریہ:

یہ فرقہ نسطور فلسفی کا پیرو تھا جو مامون کے عہد میں ظاہر ہوا۔ اس کا خیال تھا

---

[1] الملل والنحل للشہرستانی، الجزء الثانی برحاشیہ الملل والنحل لابن حزم الجزء الثانی ص۵۱ تا ۵۴۔

[2] ایضاً

کہ الٰہ واحد ذو اقانیم (علم وحیات) ہے۔ اور یہ اقانیم نہ تو اس کی ذات پر زائد ہیں اور نہ ہی ذات اقانیم پر۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ کلمہ جسد عیسٰی میں اس طرح متحد نہیں ہے جیساکہ ملکائیہ کہتے ہیں یعنی بصورتِ امتزاج اور نہ نوعیت اتحاد وہ ہے جس کے داعی و مبلّغ یعقوبیہ ہیں یعنی بطرزِ ظہور، بلکہ یہ اتحاد بلّور میں سورج کے اشراق اور خاتم میں نقش کے ظہور کے مثل ہے[1]

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ حیات اور علم دو اقنوم (جوہر) ہیں یعنی عالم کی اصل و مبدا، یہی ہیں۔ علم سے وہ نطق و کلمہ مراد لیتے تھے۔ ان میں سے بعض اللہ تعالیٰ کے لیے ایک تیسری صفت قدرت اور ارادہ کا بھی اضافہ کرتے تھے لیکن اس کو اقنوم نہیں مانتے تھے جیساکہ حیات اور علم ہیں۔ ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ اقانیم ثلاثہ میں سے حیّ ناطق الٰہ ہے اور باقی اسمائے الٰہ[2]

ان میں ایک گروہ (بوطینوس اور بولی الشمشاطی) ایسا بھی تھا جس کا خیال تھا کہ الٰہ واحد ہے اور مسیح مریم سے پیدا ہوئے، وہ مخلوق تھے اور اللہ کے نیکوکار بندے تھے اور ان کی اطاعت کی وجہ سے اللہ نے ان کو شرف واکرام سے سرفراز کیا اور ان کو بطور متبنّٰی کے نہ کہ بطور ولادت واتحاد بیٹا کہا[3]

نسطوریوں کے ایک گروہ کا نام مصلّین تھا ان کا بھی یہی خیال تھا لیکن ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ جب بندہ عبادتِ الٰہی میں کوشش کرتا ہے اور غذا اور شہواتِ نفسانیہ کو ترک کردیتا ہے۔ تو اس کا جوہر مصفّٰی ہوجاتا ہے یہاں تک کہ ملکوت السمٰوٰت تک پہنچ جاتا ہے اور اللہ کو بے نقاب دیکھتا ہے اور جو کچھ پردۂ غیب میں ہوتا ہے اس پر منکشف ہوجاتا ہے حتیٰ کہ آسمان وزمین کی کوئی پوشیدہ شے بھی اس پر مخفی نہیں رہتی[4]

---

[1] الملل والنحل للشہرستانی برحاشیہ الملل والنحل لابن حزم الجزء الثانی ص ۵۳

[2] ایضاً

[3] ایضاً

[4] ایضاً ص ۵۳ - ۵۴

نسطوری فرقہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو اللہ نہیں مانتا تھا البتہ ان کو الٰہی اوصاف سے متصف ضرور سمجھتا تھا[1] اس کے علاوہ یہ فرقہ حضرت مریم کی پرستش کا بھی قائل نہ تھا اور یہ دونوں باتیں حکومتِ وقت اور عام عیسائیوں کے بنیادی عقائد کی حیثیت رکھتی تھیں چنانچہ وہ ملحد و بے دین (Heretic) قرار دیے گئے۔ سب و شتم کا نشانہ بنے اور قسطنطنیہ سے جلاوطن کر دیے گئے۔

ان کے علاوہ ایک فرقہ اور تھا جو مسیح اور مریم دونوں کو الٰہ سمجھتا تھا اس کا نام بربری تھا[2]

مذکورہ چاروں فرقوں کے متذکرہ عقائد کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے ہم یہاں بالترتیب ان کو پیش کرتے ہیں :

(۱) يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ؗ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

(النسآء : ۱۷۱)

اے اہل کتاب تم دین میں حد سے نہ نکلو اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا کوئی بات نہ کہو۔ بے شک مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کا رسول اور اس

---

[1] وہ کہتے تھے کہ باپ الٰہ کامل ہے اور بیٹا لاہوتی اور ناسوتی دونوں سے مرکب ہے یعنی اس میں الٰہی اور انسانی دونوں اوصاف جمع ہیں۔

[2] مارونی (مریمی) نام کے ایک فرقے کا بھی ذکر ملتا ہے جس کی تثلیث میں باپ، بیٹا اور ماں داخل تھے۔

کا ایک کلمہ (حکم) تھا جسے اس نے مریم کے پاس بھیجا اور اس کی طرف سے (بھیجی ہوئی) ایک روح تھی۔ پس اللہ اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لاؤ اور ہرگز نہ کہو کہ (اللہ) تین ہیں، باز آجاؤ، اس میں تمھارے لیے بھلائی ہے۔ معبود حقیقی تو ایک ہی معبود ہے۔ وہ اس سے پاک ہے کہ صاحبِ اولاد ہو، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے سب اس کی ملک ہیں اور کارسازی کے لیے اللہ کافی ہے۔

(۲) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَ قَالَ الْمَسِيحُ يٰبَنِىٓ إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۖ

(المائدہ: ۷۲)

بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے یہ کہا کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا بھی اور تمھارا بھی رب ہے۔

(۳) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّآ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ (المائدہ: ۷۳)

بلاشبہ ان لوگوں نے کفر کیا جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تین میں کا ایک ہے حالانکہ ایک الٰہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔

(۴) وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ۚ (المائدہ: ۱۱۶)

اور (وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے) جب کہ اللہ کہے گا: اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی اللہ کے علاوہ دو معبود قرار دے لو؟ وہ کہے گا: تیری ذات اس شرک سے پاک ہے میرے لیے کسی طرح زیبا نہ تھا کہ میں وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔

قرآن مجید نے عیسائیوں کے عقائد کے بارے میں، جو کچھ کہا ہے اس کی تصدیق خود ان کی تاریخ سے ہوتی ہے۔ قسطنطین بادشاہ (۳۰۶ - ۳۳۷ء) کے عہد حکومت میں نیقا (Nicaea) کے مقام پر ۳۲۵ء میں تمام چرچوں کی جو جنرل کونسل بادشاہ کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی اور جس میں سلطنت کے تمام صوبوں سے تقریباً ۳۰۰ بشپ شریک ہوئے تھے، اس میں عیسائی دنیا کا جو متفق علیہ عقیدہ قرار دیا گیا وہ یہ تھا:[1]

"ہم خدائے واحد پر ایمان رکھتے ہیں یعنی باپ پر جو مقتدر اعلیٰ ہے، جو تمام مرئی اور غیر مرئی اشیاء کا خالق ہے، اور آقا (لارڈ) عیسیٰ مسیح پر ایمان رکھتے ہیں جو خدا کا بیٹا ہے، جو باپ سے پیدا ہوا اور ایک ہی ہے، جو باپ سے پیدا ہوا، جس کا جوہر (Essence) باپ کے جوہر کی طرح ہے:

خدا سے خدا

روشنی سے روشنی

خدا سے سچا خدا

ساختہ نہیں، آفریدہ

خدا کے جوہر سے متحد، جس کے ذریعہ تمام اشیاء خلق ہوئیں خواہ وہ اشیاء آسمان میں ہوں یا زمین میں، جو ہمارے لیے، ہماری نجات کے لیے آسمان سے نیچے آیا، جسدی ظہور ہوا، آدمی بنا، دکھ سہے اور تیسرے دن اٹھ کھڑا ہوا اور آسمان کی طرف صعود کر گیا۔"

عیسائیوں کے اس عقیدہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے جان ولیم ڈریپر

---

[1] ڈی، سی، سمرویل، اے شارٹ ہسٹری آف آور ریلیجن، مطبوعہ لندن ۱۹۴۵ء ص ۹۸۔

لکھتا ہے[1]:

"یہ فلاطونی عیسائیت (Platonic Christianity) کا ایجاد کردہ ہے اور جس کا آغاز اسکندریہ میں ہوا۔ اس مکتبِ فکر سے وابستہ فلاسفہ نے کہا کہ باپ اور بیٹے کی مثال سورج اور اس کی کرن کی ہے، جس طرح کرن سورج سے نکلتی ہے اسی طرح بیٹا باپ سے نکلا۔ حضرت عیسیٰ میں بیک وقت تین شخصیتیں جمع ہیں یعنی جسم، روح اور کلمہ (Logus) اس طرح وہ آدمی بھی ہے اور خدا بھی لیکن جس طرح سورج کی کرن سورج سے کمتر ہوتی ہے اسی طرح بیٹا باپ کے مقابلے میں کمتر ہے۔"

جسٹین مرٹائر (Justin martyr 132 A.D.) نے جو ایک فلاطونی فلسفی تھا، اس خیال کا اظہار کیا کہ شعاع الوہیت (Divine Ray) جو حضرت عیسیٰ سے وابستہ ہو گئی تھی وہ اس سے کبھی جدا نہیں ہوئی۔ اس نے عقیدۂ الوہیت مسیح کے تین دلائل دیے ہیں، ایک دلیل جو ایک زمانے میں بڑی اہم اور ناقابلِ تردید سمجھی جاتی تھی اس نے یہ دی کہ جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے لیکن اس سے پہلے چراغ کی عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اسی طرح باپ کی الوہیت بیٹے میں منتقل ہو گئی۔ اور یہ بات نیقا کونسل کے عقیدے میں داخل ہے یعنی خدا سے خدا، روشنی سے روشنی۔"

آگے مزید لکھتا ہے[2]:

"جب اسکندریہ میں عقیدۂ تثلیث کے بارے میں جھگڑا بڑھ گیا تو

---

[1] ہسٹری آف دی انٹلکچول ڈیویلپمنٹ آف یورپ، مطبوعہ لندن ۱۸۶۴ء، ج ۱ ص ۲۶۵۔

[2] ایضاً ج ۱ ص ۲۷۸۔

قسطنطین نے ۳۲۵ء میں نیقا کی کونسل بلائی اور اس میں ایریس (Arius) کے اس خیال کی تردید کی گئی کہ بیٹا آغاز رکھتا ہے لیکن باپ نہیں، اور متفقہ طور پر اس عقیدے کو تسلیم کیا گیا کہ باپ اور بیٹا باعتبار جوہر یکساں حیثیت رکھتے ہیں اور ایریس کو جلاوطن کر دیا گیا۔ الوہیت مسیح سے متعلق نیقا کی کونسل نے جو قرارداد منظور کی وہ یہ تھی:[1]

"مقدس کیتھولک اور حواری چرچ (Apostalic -). Church) اس شخص کو برادری سے خارج کرتے ہیں جو یہ کہے کہ ایک وقت ایسا تھا جب بیٹا موجود نہ تھا یا یہ کہ پیدا ہونے سے پہلے وہ نہ تھا یا یہ کہ وہ عدم (Nothing) سے یا کسی اور مادہ یا جوہر سے پیدا کیا گیا ہے، اور وہ مخلوق ہے یا قابل تغیّر و تبدّل ہے۔"

عیسائیوں کا شرک صرف عقیدے تک محدود نہ تھا بلکہ عملاً بُت پرستی کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ مسیحی روما کے کلیساؤں میں حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے مجسّمے نصب تھے اور دیواریں ان کی تصاویر سے آراستہ تھیں اور ان کی پرستش کی جاتی تھی۔[2]

ایک عیسائی مؤرخ نے کھلے لفظوں میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کو محض اس وجہ سے شکست کا منہ دیکھنا پڑا کہ وہ بت پرستی میں مبتلا تھے، وہ لکھتا ہے:[3]

---

[1] ہسٹری آف دی انٹلکچول ڈیویلپمنٹ آف یورپ ج ۱ ص ۲۷۸۔

[2] ایضاً ج ۱ ص ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹۔

[3] ڈی، سُمرویل، اے شارٹ ہسٹری آف آور ریلیجن ص ۱۵۷۔

" مشرق میں رومن بادشاہ (Leo the Isaurian, 717-740) کو یقین تھا کہ اللہ نے مذہب اسلام کو اس لیے بھیجا ہے تاکہ وہ بت پرست عیسائیوں کو سزا دے جو تماثیل اور مقدس آثار کی پرستش کرتے تھے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ تمام چرچوں میں تصاویر اور مجسّموں کو توڑ دیا جائے "

مشرکینِ عرب

دنیا کی ہر قوم میں خدائے خدائیگاں یا ربّ الارباب کا تصوّر کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتا ہے۔ عرب بھی اس بزرگ و برتر خالق کائنات کا عقیدہ رکھتے تھے اور ان کی زبان میں اس ہستی کو اللّٰہ کہا جاتا تھا۔ شعراء جاہلیت کے کلام میں اس کی نظیریں موجود ہیں، زہیر بن ابی سلمیٰ کہتا ہے :

فلا تکتمنّ اللّٰہ ما فی نفوسکم   لیخفیٰ ومہما یکتم اللّٰہُ یعلم

" جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے ہرگز نہ چھپاؤ کیونکہ اسے خواہ کتنا ہی چھپایا جائے اللہ اسے ضرور جان لے گا "

ایک اور شاعر نے اَلْإِلٰـہ کو اللّٰہ کے معنی و مفہوم میں استعمال کیا ہے [1]:

ومعاذ الْإِلٰـہ ان تکون کظبیۃ   ولا دُمیۃ ولا عقیلۃ ربرب

" اللہ کی پناہ (معاذ اللہ) وہ (محبوبہ) آہو یا بُت یا جنگلی گایوں کی ملکہ کی مانند ہو "

قرآن مجید سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ وہ خالق کائنات یعنی اللہ کو مانتے تھے جیسا کہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے :

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝

(عنکبوت : ٦١)

---

[1] علامہ زمخشری، الکشاف مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، لبنان، ج ۱ ص ۳۵ -

اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے بنایا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے مسخّر کیا ہے ؟ تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے (اس اقرار کے باوجود) پھر وہ کدھر الٹے پھرائے جا رہے ہیں۔

دوسری جگہ ہے :

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

(لقمان : ۲۵)

اگر تم ان سے دریافت کرو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، کہہ دو (اے پیغمبر) کہ حمد و ستائش کا مستحق اللہ ہی ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔

ایک اور جگہ ہے :

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ

(الزمر : ۳۸)

اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا خالق کون ہے ؟ تو ضرور کہیں گے کہ وہ اللہ ہے۔

صرف اتنا ہی نہیں کہ مشرکین عرب اللہ کو خالقِ کائنات مانتے تھے بلکہ ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ زندگی اور موت اسی کے دستِ تصرف میں ہے، وہی رازق اور وہی کائنات کا ناظم و آمر ہے جیسا کہ ایک جگہ فرمایا گیا :

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ (یونس : ۳۱)

کہو، وہ کون ہے جو تمھیں آسمان اور زمین سے رزق مہیا کرتا ہے اور وہ

کون ہے جو تمھارے کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے اور وہ کون ہے
جو بے جان چیز سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان چیز کو نکالتا ہے،
اور وہ کون ہے جو تدبیر امر کرتا ہے؟ وہ (جواب میں) ضرور کہیں گے کہ
وہ اللہ ہے۔ پس ان سے کہو کہ پھر تم کیوں (افعال شرک سے) نہیں بچتے۔

لیکن دوسری مشرک قوموں کی طرح ان کا بھی خیال تھا کہ اللہ کے علاوہ کچھ دوسرے الٰہ بھی ہیں، جو خالقِ کائنات کے شرکار کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہی سلطنتِ کائنات کا کاروبار چلاتے ہیں۔ ربّ العالمین کے ساتھ شرکار کا تخیّل ان کے مذہبی عقیدے کا جزو لاینفک تھا اور وہ اس سے کسی طرح بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے جیساکہ قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے:

وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ
نُفُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۴۶)

اور جب تم قرآن میں اپنے رب واحد کا ذکر کرتے ہو تو وہ لوگ (اس بات
سے) نفرت کرتے ہوئے پشت پھیر کر چل دیتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے:

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ ج وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ
يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ (الزمر: ۴۵)

اور جب اللہ واحد کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل منقبض ہوتے
ہیں جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور جب اس کو چھوڑ کر اوروں کا ذکر کیا
جاتا ہے تو وہ لوگ فوراً ہی خوش ہو جاتے ہیں۔

ایک اور مقام پر ہے:

اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ج وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ط

(المؤمن: ۱۲)

جب صرف اللہ کا نام لیا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک کر لیا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے۔

ان شرکاء کے متعلق ان کا یہ خیال تھا کہ وہ ان کے حاجت روا اور مصائب میں ان کے فریاد رس اور نجات دہندہ ہیں، اس سلسلے میں چند آیات قرآنی ملاحظ ہوں:

(۱) وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اٰلِہَۃً لِّیَکُوْنُوْا لَہُمْ عِزًّا ○

(مریم: ۸۱)

ان لوگوں نے اللہ کے سوا اور الٰہ بنا لیے ہیں تاکہ وہ ان کے مددگار ہوں۔

(۲) فَمَآ اَغْنَتْ عَنْہُمْ اٰلِہَتُہُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّکَ ط وَمَا زَادُوْہُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ ○

(ھود: ۱۰۱)

پس ان کے وہ الٰہ (معبود) جن کو وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے تھے ان کے کسی کام نہ آسکے جب کہ تمہارے رب کا حکم آپہنچا، بلکہ الٹا ان کو نقصان ہی پہنچایا (کہ ان کی عبادت کے سبب مستحق سزا ٹھہرے)۔

(۳) فَلَوْلَا نَصَرَہُمُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ قُرْبَانًا اٰلِہَۃً ط بَلْ ضَلُّوْا عَنْہُمْ ج وَذٰلِکَ اِفْکُہُمْ وَمَا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ○

(احقاف: ۲۸)

پس اللہ تعالیٰ کے سوا جن جن ہستیوں کو انھوں نے اللہ کے تقرب کی غرض سے معبود بنا رکھا ہے انھوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی، بلکہ وہ سب ان سے غائب ہو گئے اور وہ محض ان کی تراشیدہ اور گھڑی ہوئی بات تھی۔

(۴) وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اٰلِہَۃً لَّعَلَّہُمْ یُنْصَرُوْنَ ○ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَہُمْ وَہُمْ لَہُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ○

(یٰسٓ: ۷۴، ۷۵)

اور انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور معبود بنا لیے ہیں اس اُمید پر کہ ان کو
مدد ملے گی حالانکہ وہ ان کی کچھ بھی مدد نہیں کر سکتے ہیں اور (روزِ آخرت)
وہ ایک فریق کی صورت میں ان لوگوں کے سامنے حاضر کیے جائیں گے۔

مشرکین عرب اپنے معبودوں سے فریاد رسی اور مشکل کشائی کی جو توقع رکھتے تھے وہ براہِ راست نہ تھی بلکہ بالواسطہ تھی۔ وہ گمان کرتے تھے کہ ان کے معبود اللہ کے چہیتے ہیں اور اس کے دربار میں بڑا اثر و رسوخ رکھتے ہیں، ان کی بات وہاں ٹالی نہیں جاتی ہے، اگر وہ کسی کے حق میں اللہ سے سفارش کر دیں تو وہ ضرور سنی جاتی ہے۔ اس گمان کے مطابق وہ ان کو اپنا الٰہ بنائے ہوئے تھے اور ان کو خوش کرنے کے لیے ان کی پرستش کرتے تھے اور حاجات و بلایا میں ان کو پکارتے تھے کہ وہ اللہ سے ان کے حق میں سفارش کر دیں تاکہ ان کی حاجت پوری ہو جائے یا پیش آمدہ مصیبت سے ان کو نجات مل جائے۔ قرآن مجید میں ان کے اس خیال کا ذکر ایک جگہ ان لفظوں میں آیا ہے:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ
وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ط (یونس: ۱۸)

یہ لوگ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے
ہیں نہ نفع اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ م مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا
لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط (الزمر: ۳)

اور وہ لوگ جنھوں نے اللہ کے سوا اور کارساز بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ)
ہم تو ان کی پرستش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں۔

ایک اور جگہ ہے:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ط قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا

لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ○ (الزمر: ۴۳)

کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو (معبود) بنالیا ہے کہ وہ اللہ سے ان کی سفارش کریں گے، کہہ دو خواہ ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ ہو اور عقل و فہم سے بھی بے بہرہ ہوں۔

عربوں کے یہ شرکاء (شفاعت کنندگان) فرشتے بھی تھے، جن بھی تھے اور ان کی اپنی قوم کے وفات یافتہ نیک لوگ بھی تھے۔ فرشتوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، سورۂ نجم میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ○ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ج وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ○

(النجم: ۲۷ - ۲۸)

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کا نام عورت کے نام پر رکھتے ہیں حالانکہ اس پر ان کے پاس کوئی علمی دلیل نہیں۔ وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور ظنّی باتیں حق کے مقابلے میں بے سود ہیں۔

اور جنوں کے متعلق بھی ان کا گمان تھا کہ وہ اللہ سے نسبی تعلق رکھتے ہیں جیسا کہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ (الصّٰفّٰت: ۱۵۸)

اور ان لوگوں نے اللہ میں اور جنّات میں (بھی) رشتہ داری قرار دی ہے۔

چونکہ ان کے خیال کے مطابق جن[1] اللہ سے نسبی تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کا

---

[1] وہ غالباً جنوں کو اللہ کا بیٹا سمجھتے تھے، سورۂ انعام میں ہے:

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ (آیت: ۱۰۰)

"اور ان لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے حالانکہ وہ اس کی مخلوق ہیں اور ان لوگوں نے اللہ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تراش رکھی ہیں۔"

صاحب قدرت و اختیار ہونا لازمی تھا اور اسی لیے مشرکینِ عرب ان کی پناہ طلب کرتے اور رضا جوئی کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے، ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ○ (جن : ٦)

اور انسانوں میں بعض لوگ ایسے تھے کہ وہ جنوں میں سے بعض لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے اور انہی آدمیوں نے ان کی بد دماغی اور بڑھادی۔

دوسری جگہ ہے:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ج بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ج اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ○ (سبا : ۴۰، ۴۱)

اور جس روز اللہ ان سب کو (میدانِ حشر میں) جمع کرے گا پھر فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے، وہ کہیں گے کہ تو پاک ہے (ہر نقص و عیب سے) ہمارا تو تجھ سے تعلق ہے نہ کہ ان سے بلکہ یہ لوگ جنوں کو پوجتے تھے، ان میں کے اکثر لوگ انہی پر اعتقاد رکھتے تھے۔

مشرکینِ عرب اللہ کے شرکاء کی حیثیت سے جن اصنام کو پوجتے تھے ان میں لات، عزّیٰ اور منات زیادہ مشہور تھے۔ ہر قبیلے کا دیوتا الگ الگ تھا اور ایک خاص نام سے موسوم تھا۔ قریش کے معبود لات[1] اور عزّیٰ تھے، سونے سے قبل

---

[1] لات (ایلات) اور مناۃ (منوت) نہایت قدیم دیوتا تھے۔ حجر کے نبطی کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصحاب حجر کے خاص دیوتا تھے، ایک کتبہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

"یہ قبرستان کمکم بنت وائلہ بنت حرم اور اس کی لڑکی کلیبہ نے اپنی اولاد کے لیے طیبہ کے مہینے میں حارث شاہ انباط محبِّ قوم کے نویں سال جلوس میں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وہ ان کی پوجا ضرور کرتے تھے[1]۔ لات کا ہیکل شہر طائف[2] میں اور عزّیٰ کا نخلہ کے مقام پر تھا جو مکہ سے چند میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ مناۃ، مدینہ کے دو معروف قبائل اوس و خزرج کا معبود تھا، دوران حج میں وہ اس کی تہلیل کرتے تھے[3]۔ عرب

(حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ)

ذوالشریٰ (پہاڑ کا دیوتا) اور خریش (آفتاب دیوتا) اور لات اور عمند اور منوت (مناۃ) اور قیس اس پر لعنت کریں گے جو اس قبرستان کو بیچے گا یا خریدیگا یا رہن رکھے گا یا اس میں سے کسی کی لاش نکالے گا یا اس میں کلکم اور اس کی بیٹی اور اس کی اولاد کے علاوہ کوئی اور دفن ہو گا۔"

Cook, Noah Somirie inscription, oxford, 1903

بحوالہ ارض القرآن ج ۲ ص ۱۹۱ -

لہ مسند امام احمد بن حنبل ج ۴ ص ۲۲۲ -

۲ہ قبیلہ ثقیف کا دیوتا بھی لات تھا۔ کہا جاتا ہے کہ لات کا بت طائف میں جس پتھر پر نصب تھا وہ شکل میں سفید مربع تھا اور اس پر ثقیف نے ایک گھر بنا دیا تھا۔ اہلِ ثقیف اس کی زیارت کرتے اور اس پر چادر اور چڑھاوا چڑھاتے تھے اور اس علاقے کو نہایت محترم جانتے تھے۔ فتح طائف کے بعد ثقیف کا جو وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تھا اس نے اس شرط پر اسلام قبول کرنے کی پیشکش کی کہ انھیں صلاۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ کردیا جائے اور تین سال تک لات کو نہ توڑا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شرطوں کو رد کردیا۔ لات کو توڑنے کے لیے جو دستہ بھیجا گیا تھا اس میں ابوسفیان بن الحرب اور مغیرہ بن شعبہ شامل تھے۔ مغیرہ بن شعبہ نے جب لات کو توڑا تو عورتیں چیخنے چلانے لگیں (دی لائف آف محمد، محمد حسین ہیکل، مطبوعہ کریسنٹ پبلشنگ کمپنی علی گڈھ ص ۴۶۰، مزید دیکھیں، معجم البلدان، یاقوت حموی، مطبوعہ مصر ۱۳۲۴/۱۹۰۶ء ج ۷، ص ۳۰۹، ۳۱۰)

۳ہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ انصار مناۃ کے لیے احرام باندھتے تھے اور مناۃ ایک بُت تھا جو مکہ اور مدینہ کے درمیان تھا، ایک دوسری روایت میں ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے دوسرے قبائل میں دوسرے معبود پوجے جاتے تھے، مثلاً قبیلہ کلب ودّ کی پرستش کرتا تھا. جو دومۃ الجندل کے مقام پر تھا، ہذیل کے لوگ سواع کے پرستار تھے، قبیلہ مراد اور بنی غطیف کا دیوتا یغوث تھا. جو جرف کے مقام پر سبا کے نزدیک تھا. ہمدان میں یعوق کی پوجا ہوتی تھی، حمیر اور ذوالکلاع کا معبود نسر تھا[1] اور شام میں بعل دیوتا کی پوجا ہوتی تھی[2]۔ بجز بعل کے مذکورہ تمام معبود وہی ہیں جن کی پرستش کبھی قوم نوح کرتی تھی اور جن کا ذکر قوم نوح کے بیان میں ہو چکا ہے۔

(حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ)

کہ وہ مشلّل میں تھا (دیکھیں، صحیح بخاری، کتاب التفسیر سورہ نجم ص ۷۷۱)

یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ ھ) نے اس سلسلے میں کئی اقوال نقل کیے ہیں جو ہم یہاں اختصار کے ساتھ درج کرتے ہیں:

- یہ ایک بت تھا جو مدینہ سے ۷ میل کے فاصلہ پر سمندر کی جانب قدید کے نزدیک مشلّل میں تھا۔ قبیلہ ازد اور غسّان اس کے لیے احرام باندھتے تھے اور تہلیل کرتے تھے۔ پہلا شخص جس نے اسے وہاں نصب کیا وہ عمرو بن لحی خزاعی تھا اور وہی اسے شام سے لایا تھا. جہاں اس کی پوجا کی جاتی تھی اور اپنے عقیدے کے مطابق وہ (اہلِ شام) اس سے بارش طلب کرتے اور دشمنوں کے مقابلہ میں اس کی مدد و حمایت چاہتے تھے۔

- ابن کلبی کا بیان ہے کہ مناۃ قدید کے مقام پر ایک چٹان (صخرۃ) تھی جس کی ہذیل کے لوگ پوجا کرتے تھے اور اس کی طرف ناموں کی نسبت کی جاتی تھی مثلاً عبد مناۃ۔ اس کی تانیث کی علت صخرہ ہے۔

- یہ بت تمام عرب کے نزدیک قابلِ احترام تھا لیکن اوس و خزرج کا یہ خاص معبود تھا، وہ اس کا حج کرتے تھے چنانچہ جب تک مناۃ کے پاس نہیں پہنچ جاتے تھے حلق راس نہیں کراتے تھے اور یہاں قیام کرتے تھے۔ یہ بُت مکہ اور مدینہ کے درمیان سمندر کی جانب مشلّل کے قریب قدید کے مقام پر تھا۔ (معجم البلدان ج ۸ ص ۱۶۷، ۱۶۸)

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورہ نوح ص ۱۹۹

[2] تفسیر بیضاوی، سورالصّٰفّٰت، ج ۳ ص ۱۶۴ (طبع فی المطبعۃ النفسانیۃ العثمانیۃ)

جہاں تک تاریخی روایات کا تعلق ہے ان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے یہ معبود ان کے بعض وفات یافتہ اشخاص تھے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ "لات" لت سے مشتق ہے جس کے معنی گھولنے کے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص تھا جو حج کے دنوں میں ایک چٹان پر بیٹھ کر حاجیوں کو ستو پلایا کرتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد لوگوں نے اسی چٹان کو پوجنا شروع کر دیا اور اس کا نام لات یعنی گھولنے والا رکھا۔[۱]

یاقوت حموی نے اس سلسلے میں دو قول نقل کیے ہیں، ایک[۲] یہ کہ لات ایک چٹان تھی جس پر ایک شخص بیٹھ کر ایام جاہلیت میں حجاج کو گھی اور دودھ بیچا کرتا تھا۔

دوسرا[۲] قول ہے کہ عمرو بن لحی خزاعی کو جب مکہ پر غلبہ حاصل ہو گیا تو وہ عربوں کا آقا (رب) بن گیا اور وہ جو کام بھی کرتا تھا وہ اس کی اقتدار کرتے تھے اس لیے کہ وہ ان کے رزق کا انتظام کرتا تھا اور کپڑے پہناتا تھا چنانچہ وہ موسم حج میں ۱۰ ہزار جانور (بدنۃ) ذبح کرتا تھا۔ ایک شخص جس کا نام لات تھا ایام حج میں ایک پتھر پر جس کا نام صخرۃ اللات مشہور تھا، اس کو ستو پلاتا تھا۔ یہ شخص قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھتا تھا۔ جب وہ مر گیا تو عمرو بن لحی خزاعی نے کہا کہ وہ مرا نہیں بلکہ صخرہ (چٹان) کے اندر چلا گیا ہے پھر اس کی عبادت کا حکم دیا اور اس پر ایک عمارت بنا دی جس کا نام لات رکھا۔ عمرو اور اس کے بیٹے مکہ میں ۳۰۰ سال تک برسر اقتدار رہے۔ جب عمرو مر گیا تو بھی وہ اس کی پوجا کرتے رہے۔[۲]

۱؎ صحیح بخاری، تفسیر سورہ نجم ص ۱۷۷

۲؎ یاقوت حموی، معجم البلدان ج ۷، ص ۳۰۹، ۳۱۰

عزّی[1] اور مناۃ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ قریش طواف میں کہتے تھے:

اللات والعزّٰی ومناۃ الثالثۃ الاخرٰی تلک الغرانیق العلیٰ و ان شفاعتھن لترتجیٰ[2] "لات اور عزّٰی اور تیسرا مناۃ بزرگ لوگ ہیں، ان کی سفارش کی اُمید ہے۔" دیگر قبائل عرب کے معبودوں کے بارے میں بھی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے وفات یافتہ لوگ تھے جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس سے مروی ایک روایت میں مذکور ہے اور جسے ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔

لیکن بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ صحیح بخاری کی یہ روایت غیر مرفوع[ع] ہے اس لیے قطعیت کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ عربوں کے یہ بُت گذشتہ بزرگوں کے مجسّمے تھے جن کو انھوں نے بعد میں پوجنا شروع کر دیا۔ ان کی تحقیق کے مطابق یہ دراصل مختلف ستاروں کی خیالی صورتیں تھیں بعد میں مرورِ زمانہ سے ان کی اصلیتیں ذہنوں سے اتر گئیں اور وہ صرف پتھر اور مٹی کا ڈھیر بن کر رہ گئے۔[3]

---

[1] یہ قریش کے نزدیک نہایت قابلِ تعظیم معبود تھا چنانچہ وہ اس کی طرف نسبت کر کے نام رکھتے تھے مثلاً عبد العزّٰی۔ ابن حبیب کا بیان ہے کہ عزّٰی ایک درخت تھا جو نخلہ کے مقام پر تھا۔ اس کے قریب ایک بُت تھا جس کی اہلِ غطفان پرستش کرتے تھے۔ اس کے اوپر انھوں نے ایک قبّہ بنوا دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو بھیج کر اسے منہدم کرا دیا اور سمرہ (درخت ببول) کو جلوا دیا تھا۔ (معجم البلدان، ج ۶ ص ۱۶۵)

[2] صحیح بخاری، تفسیر سورہ نجم، نیز دیکھیں، معجم البلدان ج ۶ ص ۱۶۶

[ع] گویہ ابن عباس کا قول ہے، مرفوع روایت نہیں لیکن تفسیر قرآن کے باب میں صحابۂ کرام عموماً اپنی رائے سے کچھ کہنے سے احتراز کرتے تھے۔ وہ جو کچھ کہتے یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر کہتے تھے یا اس کی بنیاد معتبر تاریخی حقائق پر ہوتی تھی۔ بنابریں حضرت ابن عباس کے اس قول کو اکثر علماء نے راجح قرار دیا ہے۔

[3] مولانا سید سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن ج ۲ ص ۲۳۷

اس تحقیق کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ان کے بتوں کی شکلیں ستاروں کی شکلوں پر بنائی گئی تھیں مثلاً ودّ دراز قد مرد کی صورت، ایک تہمد کمر میں لپیٹے، ایک چادر اوڑھے، گلے میں تلوار حمائل، کمان لٹکتی ہوئی، ایک ترکش پڑا ہوا، سامنے نیزہ اس میں جھنڈا بندھا ہوا، ستارہ جبّار کی تقریباً یہی شکل ہے۔ سواع کی شکل عورت کی تھی، آسمان میں مرءۃ سلسلۃ ذات الکرسی وغیرہ عورت کی شکلیں ہیں۔ یغوث (فریادرس) کی شکل شیر کی تھی، ستارۂ اسد ہوگا۔ ایک فریادرس اور مددگار کی صورت شیر سے بہتر کیا خیال کی جا سکتی ہے۔ یعوق (مصیبتوں کو روکنے والا) کی صورت گھوڑے کی تھی۔ ستاروں کی ایک شکل فرس بھی ہے، عربوں کے نزدیک تو فرس حقیقۃً ان کے مصائب کا چارہ گر تھا۔ نسر ایک پرندہ کی شکل پر تھا، نسر طائر اور واقع ستاروں کی دو مشہور شکلیں ہیں۔ بابل میں نسروک کی جو سنگی مورت ملی ہے وہ بالکل گدھ کی شکل ہے[۱]۔"

مذکورہ بالا دلیل میں یقیناً وزن ہے اس لیے عربوں کے تمام معبودوں کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ ان کے وفات یافتہ لوگ تھے۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ عربوں کے بعض معبود یقیناً وہی ستارے تھے جن کی پرستش ان سے پہلے کی قومیں کرتی رہی تھیں اور بعض معبود ان کے وفات یافتہ بزرگ تھے اور بعض معبود فرشتے تھے۔ ان کے وفات یافتہ بزرگوں کے معبود ہونے کی شہادت خود قرآن مجید میں ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

اَیُشْرِکُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ ○ .....
اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ
فَادْعُوْھُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○

(اعراف: ۱۹۱ تا ۱۹۴)

---

[۱] تاریخ ارض القرآن ج ۲ ص ۲۳۷، ۲۳۸

مزید دیکھیں: فتح الباری، تفسیر سورہ نوح و معالم التنزیل (بغوی)

کیا وہ ان کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی بھی چیز کے خالق نہیں بلکہ خود مخلوق ہیں۔ .... تم اللہ کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ بھی تمھارے ہی جیسے بندے ہیں۔ پس تم ان کو پکارو پھر ان کو چاہیے کہ وہ تمھارا کہا کر دیں۔

دوسری جگہ ہے:

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ○ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ○ (النحل: ۲۰، ۲۱)

اور اللہ کے سوا جن کو یہ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کے بھی خالق نہیں بلکہ خود مخلوق ہیں، وہ مردہ ہیں نہ کہ زندہ اور یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کب (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے۔

ایک اور مقام پر ہے:

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ (النحل: ۸۶)

اور جب مشرکین اپنے شرکاء کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اے ہمارے رب یہی ہمارے وہ شرکاء ہیں جن کو ہم تجھے چھوڑ کر پکارتے تھے۔ وہ ان کے جواب میں باآواز بلند کہیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔

مذکورہ آیات میں "عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ" "اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَّمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ" اور "فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ" کے جملے واضح طور پر بتاتے ہیں کہ ان کے مصداق ستارے نہیں بلکہ متوفیٰ انسان ہی ہوسکتے ہیں۔ آخری دو آیتیں تو اس باب میں قطعی الدلالت ہیں۔

جہاں تک قبیلہ قریش اور اوس و خزرج کے اصنام یعنی لات، عزّیٰ اور مناۃ کا معاملہ ہے تو لات کو مستثنیٰ کر کے جیسا کہ پہلے بیان ہوا، باقی اصنام کے بارے

ہیں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ وفات یافتہ بزرگ تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کے نام مؤنث ہیں جو اس امر کی دلیل ہے کہ وہ مرد نہیں تھے اور کسی وفات یافتہ عورت کے معبود ہونے کا ثبوت عربوں کے خطبات اور اشعار سے نہیں ملتا۔

حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ یہ فرشتوں کی خیالی صورتیں تھیں۔ یہ بات معلوم ہے کہ مشرکینِ عرب فرشتوں کو عورت یعنی اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اسی لیے ان بتوں کے نام مؤنث رکھے گئے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ ہے: اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شَاهِدُوْنَ " (الصّٰفّٰت: ۱۴۹) "کیا اللہ کے لیے تو بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے، کیا ہم نے فرشتوں کو عورت بنایا ہے اور وہ (ان کی تخلیق کے وقت) موجود تھے۔" دوسری جگہ ہے: اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا (النسآء: ۱۱۷) "اللہ کو چھوڑ کر یہ بس عورتوں کو پکارتے ہیں۔" سورہ نجم سے اس بات کی مزید تائید ہوتی ہے کہ مذکورہ اصنام دراصل فرشتوں کے خیالی مجسّمے تھے۔ فرمایا:

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝
اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝
اِنْ هِىَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ
وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ۝
فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ۝ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِىْ
شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ
وَيَرْضٰى ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ
الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ۝ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ
يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۝

(النجم: ۱۹ تا ۲۸)

کیا کبھی تم نے لات اور عزّیٰ اور تیسرے مناۃ کے بارے میں سوچا ہے؟ کیا تمھارے

لیے تو بیٹے ہوں اور اللہ کے لیے بیٹیاں، یہ تو بڑی ناانصافی کی تقسیم ہوئی۔ یہ تو بس نام ہی نام ہیں جن کو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے گھڑ لیا ہے اللہ نے تو ان (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل بھیجی نہیں۔ یہ لوگ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ہے، کیا انسان کے لیے وہ سب ہے جس کی وہ تمنا کرے، سو اللہ ہی کے اختیار میں آخرت بھی ہے اور دنیا بھی، اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں موجود ہیں، ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی ہے بجز اس شخص کے حق میں جس کے بارے میں اللہ (سفارش کی) اجازت دیدے اور اس کے بارے میں کچھ سننا پسند فرمالے۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کا نام عورتوں کے نام پر رکھتے ہیں حالانکہ اس کی کوئی علمی دلیل ان کے پاس نہیں ہے۔ یہ محض گمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور گمان حق کے مقابلے میں ذرا بھی سودمند نہیں۔

دوسرے قبائلِ عرب کے اصنام کے بارے میں ان کے ناموں کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ ستارے ہی رہے ہوں گے لیکن اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ ان کے وفات یافتہ لوگ ہوں جن کی روحوں کا مسکن ان ستاروں کو قرار دے کر ان کے نام پر اصنام بنالیے گئے ہوں۔

بہر حال تمام مشرک قومیں ارواح پرست تھیں خواہ یہ روحیں ستاروں کی ہوں، فرشتوں کی ہوں، جنوں کی ہوں اور خواہ مردہ انسانوں کی ہوں۔ ارواح کی خیالی صورتیں کبھی مٹی کبھی لکڑی اور کبھی پتھر کے ایک مخصوص پیکر میں ڈھل جایا کرتی تھیں اور ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ مشرکین عرب ان ارواح کو الٰہ کیوں سمجھتے تھے اور ان کی پرستش کس لیے کرتے تھے؟

مشرکین عرب جن بتوں کی پوجا کرتے تھے ان کے متعلق ان کا خیال تھا جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں، کہ وہ اللہ کے دربار میں ان کے سفارشی ہیں بالفاظ دیگر وہ

اللہ کی طرف سے انتظام کائنات پر مامور ہیں اور اس کے اذن و مرضی سے بندوں کے معاملات بناتے اور بگاڑتے ہیں چنانچہ جن سے خوش ہوتے ہیں ان کے لیے اللہ سے کہہ سُن کر عزّت و کامرانی کی ساری راہیں کھول دیتے ہیں اور جن سے ناراض ہو جاتے ہیں انھیں اللہ کی نظروں سے گرا کر ذلیل و رسوا کر دیتے ہیں۔

انھوں نے اپنے بتوں کے جو نام رکھے تھے ان کی لغوی تحقیق سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ الٰہ کیوں بنائے گئے تھے۔ قریش کے ایک بُت کا نام جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، لات تھا۔ یہ کس لفظ سے مشتق ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ اس کے ایک معنی وہ ہیں جس کو حضرت ابن عباس نے بیان کیا ہے یعنی یہ لتّ سے مشتق ہے جس کے معنی گھولنے کے ہیں[1]۔ اس سلسلے میں ہم پوری روایت پہلے نقل کر چکے ہیں، لیکن یاقوت نے معجم میں لکھا ہے[2] کہ یہ لیت سے مشتق ہے جس کے معنی پھیرنے کے ہیں یعنی مصیبتوں کا پھیرنے والا گویا اس دیوی کا کام لوگوں کی فریاد رسی تھا[3]۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ ایل اور

---

[1] لتّ الشئ ، کسی چیز کو باریک کرنا یا پیسنا

لتّ السویق ، ستو میں گھی یا پانی ملانا

لتّ الماء الثیاب ، پانی کا کپڑوں کو تر کرنا (دیکھیں منجد)

[2] یاقوت حموی، معجم البلدان ج ص ۳۰۹ (لاتہ یلیتہ لیتاً)

[3] جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح طائف کے بعد اس بت کو منہدم کرایا اور اسے آگ میں جلوا دیا تو اس واقعے کو شداد بن عارض جُشمی نے اس طرح نظم کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فی الواقع مددگار دیوی سمجھی جاتی تھی :

لا تنصروا اللات ان الله یهلکها
لات کی مدد نہ کرو کہ اسے اللہ ہلاک کرے گا

وکیف نصرکم من لیس ینتصرُ
اور پھر تم اس کی مدد کیا کرو گے جو آپ اپنی مدد سے قاصر رہا

اِن التی حُرقت بالنار واشتعلت
وہ جسے آگ میں جلوا دیا گیا اور شعلوں کی نذر ہو گیا

ولم یقاتل لدی اُحجارها هَدَرُ
اور جو اپنے گھر میں بھی جنگ نہ کر سکا اور ناکام ہوا

(معجم البلدان ج ۷ ص ۳۱۰)

تائے تانیث سے مرکب ہے یعنی اصل میں یہ ایلوت تھا جب اس پر اَل تعریف کا اضافہ کیا گیا تو یہ اللوات ہو گیا اور پھر اس سے ایلات ہو گیا بمعنی دیوی۔[1]

قریش کے ایک دوسرے بت کا نام عزّٰی تھا۔ یہ عزّ سے مشتق ہے جس کے معنی غلبہ و نصرت کے ہیں۔ عزّٰی، اعزّ اسم تفضیل کی تانیث ہے،[2] یعنی بہت غالب آنے والی یا مددگار دیوی۔ یہ جنگ کی دیوی تھی چنانچہ جب جنگ احد میں مسلمانوں کو وقتی طور پر پسپائی اختیار کرنی پڑی اور حفاظت کے لیے کوہ احد پر چڑھ گئے تو لشکرِ کفار کے سردار ابو سفیان نے پکار کر کہا: اُعلُ ھبل (ہبل کی جے ہو) مسلمانوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق کہا: اللّٰہُ اَعلیٰ وَ اَجل (اللہ ہی بلند و برتر ہے) یہ سن کر سفیان نے کہا: لنا العزیٰ ولا عزیٰ لکم (ہماری طرف عزّٰی ہے، تمھاری طرف کوئی عزّٰی نہیں) مسلمانوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق جواب دیا: اللّٰہُ مولانا ولا مولیٰ لکم[3] (اللہ ہمارا آقا ہے، تمھارا کوئی آقا نہیں)

اوس و خزرج کے بت کا نام مناۃ تھا۔ اہل علم نے اس کے مختلف ماخذ قرار دیے ہیں، بعض نے مَنیٰ سے مشتق بتایا ہے جس کے معنی بہانے کے ہیں اسی سے مِنیٰ بنا ہے (جہاں ایام حج میں قربانی کی جاتی ہے) یعنی خون بہانے کی جگہ۔ اس معنی کے لحاظ سے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ یہ قربانی کا دیوتا تھا۔ یاقوت نے اس کے مختلف ماخذ بتائے ہیں جن میں سے ایک مَنا ہے جس کے معنی تقدیر کے ہیں اور ایک دوسرے معنی موت کے ہیں گویا وہ تقدیر اور موت کی دیوی تھی۔[4]

---

[1] تاریخ ارض القرآن ج ۲ ص ۲۳۴

[2] معجم البلدان (یاقوت) ج ۶ ص ۱۶۵ (جیسے اکبر سے کبریٰ اسی طرح اعزّ سے عزّیٰ بنی ہے)

[3] صحیح بخاری الجزء الخامس، باب غزوۂ احد ص ۱۲۱
مزید دیکھیں غزوۂ احد، محمد احمد باشمیل طبع ثانی ص ۲۰۲

[4] یاقوت، معجم البلدان ج ۸ ص ۱۶۷

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ وَدّ قبیلۂ کلب کا بت تھا جس کے معنی محبت کے ہیں گویا یہ محبت کی دیوی تھی۔ قدیم اقوام میں اس کے مقابل دیوی کا نام نکرہ تھا یعنی نفرت وعداوت کی دیوی۔ کتبات میں یہ دونوں نام مذکور ہیں۔ سواع قبیلۂ ہذیل کا بت تھا اس کی شکل عورت کی تھی غالباً یہ وَدّ کے بالمقابل عداوت کی دیوی تھی۔ یعوق قبیلہ ہمدان کا بت تھا۔ یہ عوق سے مشتق ہے جس کے معنی روکنے یا دفع کرنے کے ہیں گویا یہ مصیبتوں کا پھیرنے والا یعنی مشکل کشا دیوتا تھا۔ اس کی صورت انھوں نے گھوڑے کی بنائی تھی۔ یغوث قبیلہ مراد اور بنی غطیف کا دیوتا تھا۔ یہ غوث سے مشتق ہے جس کے معنی فریاد کو پہنچنے کے ہیں گویا یہ دیوتا فریاد رس تھا اس کی شکل انھوں نے شیر کی بنائی تھی، نسر حمیر کے خاندان ذوالکلاع کا معبود تھا۔ اس کی شکل گدھ سے بڑی حد تک مماثلت رکھتی تھی۔[1] نسر کے لفظی معنی گدھ کے بھی ہیں۔ اس کا مادہ "ن س ر" ہے جس کے معنی اتارنے اور ادھیڑنے کے ہیں "نسر البازی" کے معنی ہیں: باز کا چونچ سے گوشت نوچنا، تنسّر کے معنی ہیں: گدھوں کا شکار کرنا، استنسر الطائر کے معنی ہیں: قوت میں گدھ کی طرح ہونا۔ بولتے ہیں: اِنّ البغاث بارضینا یستنسر "ہماری زمین میں کمزور چیز بھی طاقتور ہو جاتی ہے۔" ان مشتقات فعلیہ سے واضح ہو گیا کہ نسر میں قوت و جارحیّت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ غالباً یہ جنگ کا دیوتا تھا جس سے بوقتِ جنگ مدد مانگی جاتی رہی ہوگی۔ بابل میں اس دیوتا کا نام نسروک تھا۔

ایک اور اہم بُت کا ذکر باقی رہ گیا ہے اور وہ ہبل ہے۔ یہ بت قریش کا معبودِ اعظم تھا اور خاص صحنِ کعبہ میں نصب تھا، اس کی شکل انسان کی سی تھی، اسی کے سامنے وہ فال کے پانسے ڈالا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اس دیوتا کی حیثیت رب کائنات کی تھی۔[2] قرآن مجید میں حضرت الیاس کے تذکرہ میں ایک جگہ آیا ہے:

---

[1] نسر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، دو ستاروں کے نام بھی ہیں، ایک نسر الطائر اور دوسرا نسر الواقع (منجد) ان دونوں ستاروں کی شکل گدھ سے ایک حد تک ملتی جلتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ[2] اگلے صفحہ پر)

اَتَدۡعُوۡنَ بَعۡلًا[1] وَّ تَذَرُوۡنَ اَحۡسَنَ الۡخَالِقِيۡنَ (الصّٰفّٰت: ۱۲۵)

"کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور سب سے اچھے پیدا کرنے والے کو چھوڑ دیتے ہو۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

---

[2] زید بن عمرو بن نفیل بن عبد العزیٰ نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل اصنام پرستی سے تائب ہو چکے تھے، اپنے اشعار میں عرب کے دوسرے بتوں کے ساتھ اس بت کا بھی ذکر کیا ہے:

أربًا واحدًا أم الف رب	أدين اذا تقسمت الامور
عزلت اللات والعزّیٰ جميعا	كذالك يفعل الجلد الصبور
فلا عزّا ادين ولا ابنيها	ولا صنمى بنى عمرو ازور
ولا هُبَلًا ازور وكان ربّا	لنا فى الدهر اذ حلمى صغير

(معجم البلدان ج ۷ ص ۳۱۱)

"جب میں نے معاملے پر غور کیا کہ رب واحد کی اطاعت کروں کہ ہزار ارباب کی؟ تو بالآخر میں نے لات وعزّیٰ سب کو چھوڑ دیا اور قوی اور حلیم شخص ایسا ہی کرتا ہے۔ میں نہ تو عزّیٰ کے آگے جھکوں گا اور نہ اس سے اچھا سلوک کروں گا اور نہ بنو عمرو کے اصنام کی زیارت کروں گا اور نہ ہبل کی جو رب تھا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو دنیا میں مجھ سے کم عقل و نادان کوئی اور نہ ہوگا۔"

---

[1] بعل ہی کی محرّف شکل ہبل ہے۔ وہ اصل میں ھبعل تھا جو عبرانی لفظ ہے۔ عبرانی میں "ھ" کلمۂ تعریف ہے۔ تاریخی روایت ہے کہ عمرو بن لحی اس ھبعل دیوتا کو شام سے لایا تھا، مکہ پہنچ کر وہ ہبل بن گیا۔ مذکورہ آیت میں اسی ہبل کو بعل کہا گیا ہے جو اپنے اصل ماخذ سے زیادہ قریب ہے۔ ہمارے مفسرین کا بیان ہے کہ بعل یمن کی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی آقا اور مالک کے ہیں۔ عربی میں بھی یہ اسی معنی میں مستعمل ہے، بولتے ہیں: من بعل هٰذه الناقة "اس اونٹنی کا مالک کون ہے"۔ اسی سے یہ شوہر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (لسان العرب بذیل مادہ ب ع ل) اس معنی میں یہ لفظ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات پر آیا ہے۔

بعل اکثر سامی اقوام کا اہم دیوتا تھا، بعلبک جو شام کا ایک قدیم تاریخی شہر ہے اسی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مشرکینِ عرب جیساکہ ان کے دیوی دیوتاؤں کے ناموں سے ظاہر ہے، الٰہ اور غلبہ واقتدار کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے یعنی ان کے نزدیک الٰہ وہ تھا جو مافوق الطبعی طاقت و اقتدار رکھتا ہو اور برے وقتوں میں اپنے ماننے والوں کی نصرت پر قادر ہو، جو یہ کام نہ کر سکے وہ ان کی نظر میں الٰہ کہلانے کا مستحق نہ تھا۔

قرآن مجید کا تصوّر الٰہ

گذشتہ صفحات میں ہم نے اُمم سابقہ کے تصوّر الٰہ کی جو تفصیلات پیش کی ہیں اس سے قطعیت کے ساتھ معلوم ہوگیا کہ ان اقوام کا شرک کس نوع کا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم توحید کے جادہ کو چھوڑ کر شرک کی راہ پر گامزن تھی حتیٰ کہ وہ قومیں جو صاحبِ کتاب تھیں یعنی یہود و نصاریٰ ان کا دامن بھی شرک سے آلودہ تھا۔ جس قوم میں آخری نبی مبعوث ہوئے وہ بھی سرتاپا شرک کے گڑھے میں اتر چکی تھی۔ جنات، فرشتے اور وفات یافتہ انسان سب اس کے الٰہ و رب تھے۔ ہر ایک کی وہ پوجا کرتی تھی اور ہر ایک سے حاجات و بلایا میں طالبِ امداد ہوتی تھی۔ وہ خالق کسی کو اور الٰہ و رب کسی اور کو مانتی تھی۔ قرآن مجید نے انھیں ان کا بھولا ہوا توحید کا سبق پڑھایا جسے کبھی ابراہیم اور اسماعیل علیہما السّلام نے پڑھایا تھا۔ انھیں بتایا گیا کہ اس کائنات

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

دیوتا کی طرف منسوب ہے۔ بعض تفاسیر میں ہے کہ یہ دیوتا چودہ ہاتھ لمبا اور سونے کا بنا ہوا تھا اور اس کے چار منہ تھے (معالم التنزیل تفسیر آیت مذکورہ) توراۃ میں جن دیوتاؤں کے نام مذکور ہیں ان میں بعل بھی ہے (تثنیہ ۱۲-۳۱، عدد- ۲۲-۴۱-۲۵ - ۱۲) بعل کے لیے مذبح اور ہیکل بنائے جاتے تھے اور اس کے نام پر اولاد کو ذبح کر کے چڑھاتے تھے اور یہ بہترین قربانی سمجھی جاتی تھی (تثنیہ ۱۲-۳۱، یرمیاہ ۱۹)

بعض مستشرقین نے لکھا ہے کہ بعل ستارہ زحل کا نام تھا اور اسی کی عربی شکل ہبل ہے، قوم مدین اس کی پرستش کرتی تھی اور اونٹ کی قربانی اس کے لیے افضل سمجھی جاتی تھی۔

(دیکھیں، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، لیڈن ۱۹۶۰ء ج ۱ ص ۹۶۸، ۹۶۹)

میں ایک اللہ کے سوا کوئی اور وجود ایسا نہیں جس کے سامنے انسان سجدہ ریز ہو، جس کی عبادت کو وہ اپنا مقصدِ حیات قرار دے کیونکہ وہی انسانوں کا خالق بھی ہے اور ان کا حاکم بھی اس لیے وہی ان کا معبودِ حقیقی بھی ہے۔ اس مختصر وضاحت کے بعد اب ہم تفصیل کے ساتھ قرآن مجید کے تصوّرِ الٰہ کو پیش کرتے ہیں۔

گذشتہ قوموں نے جس وجہ سے ایک اللہ کو چھوڑ کر متعدد الٰہ بنالیے تھے وہ یہ خیال تھا کہ اس کائنات میں اللہ کے علاوہ بھی کچھ صاحبِ اقتدار ہستیاں موجود ہیں جو اللہ کی طرف سے عالمِ اسباب پر حکمراں ہے۔ قرآن مجید نے بتکرار اور پورے زور وقوت کے ساتھ تعدّدِ اقتدار کے مشرکانہ تخیّل کا ابطال کیا اور واضح لفظوں میں انسانوں کو بتایا کہ ایک اللہ کے سوا، جو کل موجوداتِ عالم کا خالق ہے، اس کائنات میں کوئی دوسرا وجود ایسا نہیں جو ذاتی یا عطائی کسی نوع کا بھی ادنیٰ اقتدار رکھتا ہو۔ "لا الٰہ الا اللہ" جو اسلام کا توحیدی کلمہ ہے اس کا یہی مفہوم ہے۔ یہ کلمہ اس کائناتی حقیقت کا اعلان ہے کہ یہاں جو وجود بھی ہے وہ اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کے تابع ہے۔

بظاہر ہم اس کائنات میں قوت وعظمت کے جو بوقلموں مظاہر دیکھتے ہیں خواہ اس قوت وعظمت کا ظہور مظاہرِ فطرت کی صورت میں ہو، خواہ انسانوں کی شکل میں، ان میں سے ایک بھی ذاتی اور غیر فانی نہیں بلکہ اللہ وحدہ لاشریک کے عطا کردہ ہیں[1] اور فانی بھی۔ وہ جب چاہے چشم زدن میں یہ قوت وعظمت ان سے چھین لے اور وہ مورِ ناتواں کی صورت عاجز وناتواں بن کر رہ جائیں۔ اس اہم حقیقت کی طرف

---

[1] اسی حقیقت کو فراموش کردینے کی وجہ سے اکثر قومیں شرک میں مبتلا ہوئیں اور آج بھی ہیں، سورج اور دیگر اجرامِ فلکی کی پوجا اس لیے کی جاتی ہے کہ ان کی تابناکی اور ان کے جلال وجمال کو ان کا وصفِ ذاتی سمجھا جاتا ہے، خود ایک انسان دوسرے انسان کو الوہیت کے مقام پر محض اس بنا پر فائز سمجھ لیتا ہے کہ وہ بعض غیر معمولی دماغی اور روحانی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے حالانکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہوتا ہے۔

قرآن مجید نے انسان کی توجہ ان لفظوں میں مبذول کرائی ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ (الانعام: ۴۶)

کہو، تم نے کبھی سوچا کہ اگر اللہ تمہاری قوت سماعت و بصارت کو سلب کرلے اور تمہارے دلوں پر مہر کردے (یعنی عقل چھین لے) تو اللہ کے سوا کون الٰہ ایسا ہے جو تمھیں یہ قوت واپس لادے گا۔

دوسری جگہ ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ○ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ (القصص: ۷۱، ۷۲)

اے نبی، ان سے کہو، کیا تم لوگوں نے کبھی غور کیا ہے کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ رات ہی رہنے دے تو اللہ کے سوا کون الٰہ ہے جو تمھیں روشنی لاکر دے، کیا تم (اس معقول بات کو بھی) سنتے نہیں؟ ان سے کہو، کیا کبھی تم نے غور کیا ہے کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ دن ہی رہنے دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے۔ جو تمھیں رات لاکر دیدے جس میں تم آرام پاؤ، کیا تم دیکھتے نہیں؟

یہ ایک امر بدیہی ہے کہ نظامِ ارض وسما میں جو قوت غالب و متصرّف ہے وہ ایک اللہ کی ذات ہے۔ امام رازی آیت "ولہ الملک" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں[1]:

---

[1] امام رازی، تفسیر کبیر مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت ج ۲۵ ص ۲۴۵، ۲۴۶

"پھر فرمایا لَهُ الْمُلْكُ - اس سے حصر کا فائدہ حاصل ہوتا ہے یعنی اقتدار (ملک) صرف اسی کا ہے اس کے سوا کسی دوسرے کا اقتدار نہیں - اور جب ثابت ہوگیا کہ اقتدار کا مالک وہی ہے تو یہ کہنا ضروری ٹھہرا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، کیونکہ اگر فی الحقیقت کوئی دوسرا الٰہ ہوتا تو پھر یا تو وہ صاحب اقتدار ہوتا یا بے اقتدار ہوتا پس اگر وہ صاحب اقتدار ہوتا تو مختلف اقتدارات میں ٹکراؤ ناگزیر ہوتا جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: لَوْكَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا - اور یہ ناممکن ہے۔ اور اگر دوسرا الٰہ کسی نوع کے اقتدار کا بھی مالک نہ ہو تو وہ ناقص ہے اور اس کو الٰہ قرار دینا درست نہیں۔ پس جب دلیل سے ثابت ہوگیا کہ اللہ کے سوا کوئی ذی اقتدار نہیں تو یہ کہنا واجب ہوا کہ کل جہاں کا اور تمام مخلوقات کا ایک ہی الٰہ اور معبود ہے"

اقتدار اور الوہیت کے اس لزوم کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے[1]:

"الوہیت اور اقتدار لازم و ملزوم ہیں اور اپنی روح و معنی کے اعتبار سے دونوں ایک ہی چیز ہیں جو اقتدار نہیں رکھتا وہ الٰہ نہیں ہوسکتا اور اسے الٰہ نہیں ہونا چاہیے اور جو اقتدار رکھتا ہے وہی الٰہ ہوسکتا ہے اور اسی کو الٰہ ہونا چاہیے کیونکہ الٰہ سے تمھاری جس قدر ضروریات متعلق ہیں یا جن ضروریات کی خاطر تمھیں کسی کو الٰہ ماننے کی حاجت پیش آتی ہے ان میں سے کوئی ضرورت بھی اقتدار

---

[1] قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں، مطبوعہ دارالاسلام، پٹھان کوٹ، پنجاب، دوسرا ایڈیشن، ص ۲۳

کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی لہٰذا غیر مقتدر کا الٰہ ہونا بے معنی اور حقیقت کے خلاف ہے اور اس کی طرف رجوع کرنا لاحاصل ہے۔"

جب ثابت ہو گیا کہ الٰہ اور اقتدار لازم و ملزوم ہیں[1] اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اللہ کے علاوہ اس کائنات میں کوئی دوسرا وجود معمولی اقتدار بھی نہیں رکھتا تو پھر تعدّد الٰہ کا نظریہ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید نے تعدّد الٰہ کے مشرکانہ نظریے کے ابطال کے لیے جو عقلی دلیل دی ہے وہ خلق عالم ہے۔ تمام مشرک قومیں یہ عقیدہ رکھتی چلی آ رہی ہیں کہ اس جہان آب و گل کا ایک ہی خالق ہے۔ آج بھی جو مشرک قومیں ہیں وہ یہی اعتقاد رکھتی ہیں۔ قرآن مجید نے تمام مشرکین سے ان کے اسی اعتقاد کی بنیاد پر سوال کیا ہے کہ جب تم خود تسلیم کرتے ہو کہ اس کائنات کا ایک ہی خالق ہے تو پھر الٰہ متعدد کیسے ہو سکتے ہیں، تعدّد الٰہ تعدّد خالق کو مستلزم ہے اور یہ خود تمہارے قول کے خلاف ہے۔

قرآن مجید نے واضح لفظوں میں کہا کہ الٰہ ہونے کے لیے خالقیت کی صفت سے متّصف ہونا ضروری ہے، جو خالق نہیں وہ الٰہ نہیں ہو سکتا ہے اس لیے ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں کہ وہی زمین اور آسمانوں کا اور اس کی ہر چیز کا خالق ہے اس کے علاوہ اس کائنات میں کوئی دوسرا وجود نہیں جو وصفِ خالقیت سے بہرہ ور ہو۔ اس کائناتی حقیقت کو ایک سے زیادہ مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ یہاں چند آیات درج کی جاتی ہیں:

---

[1] الٰہ اور اقتدار کے اس لزوم کو ہمارے اکثر علماء اور مفسّرین نے نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ لا الٰہ الا اللہ کہہ کر قرآن مجید جس حقیقت کو دل و دماغ میں راسخ کرنا چاہتا ہے وہ دراصل کائناتی اقتدار کی وحدت ہے یعنی اس کائنات میں ایک اللہ ربّ العزّت کے علاوہ کوئی دوسرا صاحبِ اقتدار ہے ہی نہیں اور اگر بظاہر کوئی صاحبِ اقتدار نظر آتا ہے تو یہ اس کا اقتدار ذاتی نہیں بلکہ سر تا سر عطائی اور وہبی ہے جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔

(١) اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا ۝ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ وَلَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝ (الفرقان: ٢، ٣)

وہ جو آسمانوں اور زمین کی حکومت کا مالک ہے اور جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا اور اقتدار حکومت میں جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر سب کا الگ الگ پیمانہ رکھا (لیکن اس کے باوجود) لوگوں (مشرکین) نے اسے چھوڑ کر ایسے الٰہ بنا لیے جو کسی چیز کے خالق نہیں بلکہ خود مخلوق ہیں اور خود اپنی ذات کے لیے بھی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے اور جن کو موت اور زندگی اور (روز قیامت) دوبارہ جلانے پر کوئی قدرت حاصل نہیں ہے۔

(٢) اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ (الحج: ٧٣)

تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو (ان کی ناطاقتی کا یہ حال ہے کہ) وہ ایک (ادنیٰ) مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے گو سب اس کے لیے اکٹھے ہو جائیں۔

(٣) خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ یُكَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ ۝ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ ؕ یَخْلُقُكُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ ۝ (الزمر: ٥، ٦)

اس نے آسمانوں اور زمین کو با مقصد پیدا کیا، وہ رات کو دن پر اور دن کو رات
پر لپیٹتا ہے، (یعنی گردشِ لیل و نہار کا نظام قائم کیا) اس نے سورج اور چاند
کو (ایک قانون کے تحت) مسخر کر رکھا ہے، ہر ایک ایک وقتِ مقررہ تک
گردش کرتا رہے گا۔ سن لو کہ وہ اللہ زبردست طاقت والا ہے اور بڑا بخشنے
والا بھی ہے۔ اس نے تم لوگوں کو ایک جان سے پیدا کیا پھر اسی سے اس کا جوڑا
بنایا اور تمہارے (نفع کے) لیے آٹھ نر و مادہ چوپایوں کے پیدا کیے، وہ تم کو تمہاری
ماؤں کے پیٹ میں تین تاریک پردوں کے اندر مختلف مدارج تخلیق سے گزار کر
بناتا ہے، یہی اللہ تمہارا رب ہے، سلطنت اسی کی ہے اس کے سوا تمہارا
کوئی الٰہ نہیں ہے، تم کہاں پھرے جا رہے ہو؟

(۴) أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ج
فَأَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ج مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْۢبِتُوْا
شَجَرَهَا ءَ إِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ○ أَمَّنْ
جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ أَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ
وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ط ءَ إِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط بَلْ أَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ○ أَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ
السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْأَرْضِ ط ءَ إِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط قَلِيْلًا
مَّا تَذَكَّرُوْنَ ○ أَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ
وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ط ءَ إِلٰهٌ مَّعَ
اللّٰهِ ط تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ أَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ
وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ ط ءَ إِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط قُلْ
هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ (النمل: ۶۰ تا ۶۴)

کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے تمہارے لیے پانی برسایا
پھر اس سے رنگ برنگ باغ اُگائے جن کے درخت اُگانا تمہارے بس میں

نہ تھا ۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی ہے ؟ (جو ان کاموں میں اس کا شریک ہے) یقیناً ایسا نہیں ہے مگر پھر بھی یہ حق سے منہ موڑتے ہیں، پھر وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس میں دریا جاری کیے اور پہاڑ بنائے (تاکہ اس کا توازن قائم رہے) اور دو سمندروں کے درمیان پردہ حائل کیا ۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی (ان کاموں میں شریک) ہے ؟ یقیناً ایسا نہیں ہے لیکن اکثر مشرکین بے علم ہیں ۔ پھر وہ کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے اور اس کی تکلیف کو دور کرتا ہے اور تم کو زمین پر خلیفہ بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی (ان کاموں میں شریک) ہے ؟ یقیناً ایسا نہیں ہے لیکن تم کم ہی توجہ دیتے ہو ۔ پھر وہ کون ہے جو تم کو خشکی اور دریا کی تاریکیوں میں راستہ دکھاتا ہے اور کون اپنی رحمت (بارش) سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے ؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی (ان کاموں میں شریک) ہے ؟ یقیناً اللہ کی ذات اس شرک سے بلند ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں ۔ پھر وہ کون ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی، اور کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی (ان کاموں میں شریک) ہے ؟ (یقیناً ایسا نہیں ہے لیکن پھر بھی) ان سے کہو کہ اگر تم اپنے شرک کی صداقت پر یقین رکھتے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو ۔

(۵) الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِى السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِىْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ (الاحقاف: ۴، ۵)

کیا کبھی تم نے ان معبودوں کے بارے میں غور کیا ہے جن کو تم اللہ کو چھوڑ کر (حاجت روائی کے لیے) پکارتے ہو ؟ مجھے دکھاؤ تو سہی کہ انھوں نے زمین کی کون سی چیز بنائی ہے یا آسمانوں کی تخلیق میں ان کا کچھ حصہ ہے ۔ اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہوگا

جو اللہ کو چھوڑ کر ایسے کو پکارے جو قیامت تک اس کی حاجت پوری نہ کر سکے۔

(٦) اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ..... وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ .... اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ج (النحل: ۱۷ تا ۲۲)

تو کیا وہ جو پیدا کرے اور وہ جو پیدا نہ کرے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ...... اللہ کو چھوڑ کر یہ جن کو پکارتے ہیں وہ کسی چیز کے بھی خالق نہیں بلکہ خود مخلوق ہیں .... تمہارا معبود تو بس ایک ہی معبود ہے۔

معلوم ہوا کہ الٰہ ہونے کے لیے خالق ہونا ضروری ہے اور اس کائنات میں جو وجود بھی ہے وہ مخلوق ہے اس لیے کوئی مخلوق ہستی الٰہ نہیں ہو سکتی ہے[1]۔ مخلوق ہونا عاجزی اور بے اختیاری کو ظاہر کرتا ہے۔ جو خود اپنے وجود کا خالق نہیں اس کو الٰہ یعنی صاحبِ اقتدار و اختیار قرار دینا حد درجہ نادانی کی بات ہے۔ فی الواقع اس کائناتِ خلقت کا ایک ہی خالق اور ایک ہی الٰہ ہے اور وہ اللہ کی ذاتِ والا صفات ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ قرآن مجید نے جہاں تعدّدِ الٰہ کی نفی کی ہے اور غیر اللہ کی الوہیت سے انکار کیا ہے وہاں عام طور پر اس سے نسبی تعلق کا ابطال مقصود ہے کیونکہ نسبی تعلق ہی کی بنیاد پر الٰہ کا تعدّد ممکن ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے

---

[1] ولا يكون الٰه حتى يكون معبودا وحتى يكون لعابده خالقاً ورازقاً ومدبّرًا وعليه مقتدرًا فمن لم يكن كذٰلك فليس بالٰه وان عُبد ظلماً بل هو مخلوق ومتعبَّدٌ۔ (لسان العرب ج ۱۷ ص ۳۶۷)

"کسی ہستی کو صرف اس وقت الٰہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ معبود ہو اور معبود ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ عابد کا خالق، رازق، اور مدبّر ہو اور ساتھ ہی اس پر تصرّف کا اختیار بھی رکھتا ہو۔ جو ایسا نہ ہو وہ الٰہ کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا خواہ ظلم و جبر سے وہ پوجا ہی جائے، وہ ہر حال میں مخلوق و مطیع ہی ہوگا۔"

بیان کر چکے ہیں، اکثر مشرک قوموں کا یہ اعتقاد رہا ہے اور آج بھی ہے کہ اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ اس نسبی تعلق میں فرشتوں اور جنوں کے ساتھ حضرت انسان بھی برابر کے شریک رہے ہیں۔ عیسائیوں نے توصاف لفظوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو اللہ کا بیٹا قرار دے رکھا ہے۔

تعدّد الٰہ کی نفی کے ساتھ قرآن مجید نے شرکت اقتدار کے تصوّر کی بھی نفی کی ہے کیونکہ اس معنیٰ میں بھی بعض مخلوقات کو الٰہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم نے نہایت واضح طور پر اس حقیقت نفس الامری کا اعلان کیا کہ اس کا اقتدار ناقابلِ تقسیم ہے۔ اس نے اپنے اقتدار و اختیار کا شمہ برابر حصّہ بھی مخلوق کی طرف منتقل نہیں کیا ہے۔

اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیا جائے کہ اس کے اقتدار میں مخلوق ہستیاں مثلاً ستارے اور مردہ انسان کسی نوع کی شرکت رکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تنہا اپنی سلطنت کا انتظام چلانے سے قاصر ہے دوسرے لفظوں میں اس کا اقتدار کامل نہیں ہے اور اللہ کی ذات اس نقص اور ہر نوع کے عیب سے کلیتہً منزّہ ہے! الٰہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ جس کا اقتدار حد درجہ کامل ہو اور اگر اقتدار ہر اعتبار سے کامل نہیں ہے تو پھر اس پر الٰہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر شرکت اقتدار کے تصوّر کی تردید ملتی ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

(۱) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۱۱)

اور کہہ دو کہ ساری تعریف اس اللہ کے لیے خاص ہے جو نہ اولاد رکھتا ہے اور نہ سلطنت میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار ہے اور اس کی خوب بڑائی بیان کرو۔

قرآن مجید نے صرف شرکتِ اقتدار کے تصوّر کی تردید ہی پر اکتفا نہیں کیا

بلکہ یہ بھی واضح کر دیا کہ اللہ کے علاوہ جن جن ہستیوں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر پکارا جاتا ہے وہ ذرّہ برابر بھی اقتدار و اختیار نہیں رکھتیں، وہ بالکل عاجز و بے اختیار ہیں، ان کے قبضۂ قدرت میں رائی کا ایک دانہ بھی نہیں، دوسروں کو نفع و نقصان پہنچانا تو درکنار وہ خود اپنے نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتیں۔ جن وفات یافتہ بزرگوں کے بارے میں ان کے معتقدین یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ احوال عالم سے باخبر ہیں وہ سخت نادان ہیں۔ یہ بزرگ قطعاً نہیں جانتے کہ ان کے مرنے کے بعد دنیا میں کیا ہو رہا ہے، وہ یہ تک نہیں جانتے کہ ان کے معتقدین ان کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر پکارتے ہیں۔ روز آخرت جب انھیں اس شرک کی خبر دی جائے گی تو وہ اس کا انکار کر دیں گے اور اس وقت مشرکین صاف دیکھ لیں گے کہ وہ دنیا میں جن بزرگوں کو صاحب اختیار سمجھ کر پکارا کرتے تھے وہ بالکل بے اختیار ہستیاں تھیں۔ ان کی اس عاجزی اور بے اختیاری کو قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات پر بیان کیا گیا ہے، یہاں چند آیات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝

(الاحقاف: ۵ تا ۶)

اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ایسے کو پکارے جو قیامت تک اس کی حاجت روائی نہ کرے اور ان کو پکارنے کی بھی خبر نہ ہو اور جب (روز قیامت) سارے انسان جمع کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی عبادت کا ہی انکار کر دیں گے۔

(۲) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ

يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۭ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۝

(فاطر: ۱۲-۱۳)

وہی اللہ تمہارا رب ہے، اقتدار اور بادشاہی اسی کی ہے۔ اسے چھوڑ کر جن ہستیوں کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کی بھی مالک نہیں (یعنی بالکل بے اختیار ہیں) اگر تم انھیں پکارو تو وہ (بذات خود) تمہاری پکار سن نہیں سکتے اور اگر (کسی ربّانی ذریعہ سے) سن بھی لیں تو تمہاری حاجت روائی نہیں کر سکتے اور روز قیامت تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے۔ ایک خبردار (یعنی اللہ) کے سوا کوئی دوسرا تمہیں اس حقیقت کی خبر نہ دے گا۔

(۳) لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۗءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۭ (الرعد: ۱۴)

اسی کو پکارنا برحق ہے جو لوگ اس کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں وہ ان کی ادنیٰ حاجت بھی پوری نہیں کر سکتے ہیں، انھیں پکارنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنی دونوں ہتھیلیوں کو پانی کی طرف پھیلائے کہ اس کے منہ تک پہنچ جائے حالانکہ وہ اس تک پہنچنے والا نہیں۔

(۴) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۔ (البقرۃ: ۱۶۵)

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے سوا اوروں کو اس کا شریک و مماثل قرار دیتے ہیں، ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنی چاہیے حالانکہ جو ایمان والے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ کاش یہ ظالم (مشرک) اس حقیقت کو جسے وہ (روز آخرت) عذاب دیکھ کر جانیں گے آج ہی جان لیتے کہ قوت ساری کی ساری اللہ ہی کے پاس ہے۔

(۵) وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۔ (یٰسٓ : ۷۵)

اور انھوں نے اللہ کے سوا اور الٰہ بنا رکھے ہیں اس امید میں کہ (بوقت حاجت و مصیبت) ان کو مدد ملے گی لیکن وہ ان کی کچھ مدد نہیں کر سکتے ہیں۔

(۶) اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ۭ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ (الانبیآء : ۴۳)

کیا وہ ہمارے سوا اور بھی الٰہ رکھتے ہیں جو (بوقت مصیبت) ان کو بچا لیتے ہوں؟ (حقیقت واقعہ یہ ہے کہ) وہ خود اپنی ذات کو کوئی مدد پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے اور نہ ہمارے مقابلے میں کوئی اوران کو مدد دے سکتا ہے۔

ہم نے اوپر "الٰہ" کے جس قرآنی تصوّر کی وضاحت کی ہے وہ دراصل اس کے ایک پہلو یعنی الوہیت بمعنی اقتدار اعلیٰ سے متعلق ہے۔ لیکن الٰہ کا یہ کل مفہوم نہیں۔ اس میں دوسرے مفہومات بھی شامل ہیں[۱]۔ میری مراد الٰہ کے صفاتی تصوّر سے ہے جس کی تشریح و تفصیل اگلے صفحات میں کی گئی ہے۔

---

[۱] الٰہ کا ترجمہ اردو میں عام طور پر معبود کیا جاتا ہے جو عربی ترجمہ سے ماخوذ ہے لیکن اس کا جو مفہوم بیان کیا جاتا ہے وہ عربی مفہوم سے کم تر ہے یعنی معبود سے مراد وہ ہستی ہے جس کی پرستش کی جائے حالانکہ عربی میں معبود کے لغوی معنی مطاع کے ہیں جس میں دیگر مفہومات بالخصوص پرستش کا مفہوم بھی شامل ہے۔

جن علماء نے اسے مقتدر اعلیٰ کے معنی میں لیا ہے انھوں نے اسے الٰہ کا کلی مفہوم قرار دیا ہے جیسا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی معروف کتاب "قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں" میں لکھا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اقتدار اعلیٰ الٰہ کا مرکزی مفہوم ہے لیکن قرآن مجید نے اس مرکزی مفہوم کی جو تشریح کی ہے اس کو بھی تحریر کرنا چاہیے تھا، میری مراد الٰہ کے صفاتی تصوّر سے ہے، کیونکہ اس تصوّر سے صرف نظر کر لینے سے بہت سی غلط فہمیوں کا دروازہ کھل سکتا ہے اور کھلا بھی ہے۔

الٰہ کا جامع قرآنی مفہوم

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا موجود نہیں ہے جو تنہا خالق کائنات کی صحیح صحیح تعبیر و تشریح کر سکے۔ عربی زبان اپنی تمام تر معنوی وسعتوں کے باوجود اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ نزولِ قرآن سے قبل عربی زبان میں خالق کائنات کے لیے جو لفظ مستعمل تھا وہ اللہ تھا جسے لفظ الٰہ پر ال تعریف کا داخل کر کے اسم علم بنا لیا گیا تھا اور صرف اسی کے لیے خاص ہو گیا تھا جیسا کہ ہم شروع میں بتفصیل بتا چکے ہیں۔ لفظ الٰہ بغیر ال تعریف کے ان معبودوں کے لیے مستعمل تھا جن کی پرستش مشرکینِ عرب اللہ کو چھوڑ کر کیا کرتے تھے۔ اس پرستش کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کو صاحب اقتدار و اختیار سمجھتے تھے گویا اللہ اور الٰہ باعتبار معنی یکساں تھے فرق صرف درجے اور مرتبے کا تھا۔

لیکن خالق کائنات کی حقیقی تشریح و تعبیر کے لیے تنہا لفظ اللہ ناکافی تھا اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ اقتدار ہے لیکن یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ کائنات کا مقتدر اعلیٰ یا بادشاہ حقیقی اور کن صفات سے متصف ہے۔ مثلاً کائنات پر اس کا اقتدار کیوں کر قائم ہے یعنی وہ کس طرح اس وسیع و عریض کائنات کا انتظام کسی کی مدد کے بغیر چلا رہا ہے، کیا وہ دنیوی بادشاہوں کی طرح مغلوب الغضب ہے یا نہایت رحیم و کریم ہے اور اپنی مخلوقات کے ساتھ ناقابل تصور حد تک عفو و درگذر کا معاملہ کرتا ہے، کیا وہ مطلق العنان ہے یا کسی قانون و ضابطہ کے مطابق حکومت کرتا ہے، کیا وہ عادل ہے یا عدل کے خلاف بھی کرتا ہے، کیا اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے یا غیر حکیمانہ طور پر جو کچھ اس کے جی میں آتا ہے کر گذرتا ہے وغیرہ؟

ظاہر ہے کہ ان تمام اُمور کا احاطہ محض لفظ اللہ سے ممکن نہ تھا اس لیے قرآن نے اس مقصد کے لیے بہت سے توصیفی الفاظ استعمال کیے۔ سب سے پہلے اس نے

اقتدار کے ساتھ رحمت کے تصوّر کو وابستہ کیا اور اس مقصد کے لیے اس نے رحمٰن کا لفظ استعمال کیا جو رحمت سے فعلان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ نزول قرآن سے پہلے یہ لفظ عربی زبان میں اللہ کے لیے بطور اسم علم مستعمل نہ تھا[1] چنانچہ جب قرآن مجید میں یہ لفظ خالق کائنات کے لیے بطور اسم علم استعمال ہوا تو عربوں نے تعجب سے کہا:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ
اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ۝ (الفرقان: ٦٠)

اور جب ان (مشرکوں) سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا چیز ہے؟ کیا ہم اس کو سجدہ کرنے لگیں جس کو تم سجدہ کرنے کے لیے کہہ دو اور اس بات سے وہ اور متنفّر ہوتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے:

وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۔ (الانبیاء: ٣٦)

اور یہ لوگ رحمٰن کے ذکر پر اس کے منکر ہو جاتے ہیں۔

---

[1] شعراء جاہلیت کے کلام میں رحمٰن کا لفظ بکثرت ملتا ہے لیکن تقریباً ہر جگہ بطور اسم صفت کے استعمال کیا گیا ہے مثلاً حاتم طائی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

يقولون اهلكت مالك فاقتصد   وماكنت لولا ماتقولون سيّدا
كلوا الآن من رزق الاله وايسرا   فانّ على الرحمٰن رزقكم غدا

"لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ تم نے اپنا مال برباد کر ڈالا، تمھیں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے اگر میں تمھارے اس قول پر عمل کرتا تو ہرگز سردار نہ ہوتا۔ اللہ کی طرف سے جو رزق تمھیں آج حاصل ہے اسے کھاؤ (کل کی فکر نہ کرو کیونکہ کل کی روزی) خدائے رحمٰن کے ذمہ ہے۔"

ہمارے اکثر علماء نے رحمٰن کو اسم صفت قرار دیا ہے، راقم سطور کا بھی پہلے یہی خیال تھا لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ اسم علم ہے اور قرآن مجید میں تقریباً ہر جگہ اسی حیثیت سے استعمال ہوا ہے۔

اللہ کے ساتھ رحمٰن کو بطور اسم علم اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں کے ہاں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، خدا کا جو تصوّر ملتا ہے اور جس پر تورات کے صفحات آج بھی شاہد ہیں، وہ بادشاہ ذی اقتدار کا تصوّر ہے جس میں قہر و غضب کا عنصر غالب ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ بنی اسرائیل کا خدا مغلوب الغضب ہے اس کا انتقام صرف مجرموں تک محدود نہیں رہتا بلکہ ان کی اولاد تک سے انتقام لیتا ہے۔ اس کے برخلاف عیسائیوں کے تصوّر الٰہ میں غصّہ و غضب کا کوئی عنصر نہیں ملتا، ان کا خدا نہایت ہی رحیم و شفیق ہے۔ اسی لیے انھوں نے خدا کے لیے باپ کی اصطلاح وضع کی یعنی جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کے حق میں نہایت مہربان ہوتا ہے اسی طرح خدا بھی اپنے بندوں کے حق میں رحیم و کریم واقع ہوا ہے اس درجہ رحیم و کریم کہ اس نے (بقول ان کے) ان کے گناہوں کا کفّارہ ادا کرنے کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو مصلوب کرا دیا۔

ضروری تھا کہ الٰہ کے ان دونوں انتہاپسندانہ تصوّرات کی تصحیح کی جاتی چنانچہ قرآن مجید نے بتایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ اس کائنات خلقت کا مقتدر اعلیٰ اور انسانوں کا بادشاہ حقیقی ہے لیکن اس بے مثال طاقت و قدرت کے باوجود وہ اپنی مخلوقات کے لیے نہایت ہی رحیم و شفیق ہے اس سے کہیں زیادہ رحیم و شفیق جتنا کہ ایک انسان رحمت و شفقت کا تصوّر کر سکتا ہے۔

رحمت و شفقت کے اس تصوّر کو نمایاں کرنے کے لیے قرآن مجید نے رحمٰن کے علاوہ بعض صفاتی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں مثلاً ایک لفظ ودود[1] ہے جس کے معنی محبت کرنے والے کے ہیں، ایک لفظ ولی[2] ہے جس کے معنی دوست کے ہیں، ایک لفظ رؤف[3] ہے جو رافت سے مشتق ہے، رافت کے معنی اس محبت اور تعلق خاطر کے

---

۱ سورہ ہود : ۹۰

۲ سورہ بقرہ : ۱۲۰، ۱۰۷

۳ سورہ نحل : ۷، ۴۷، حج : ۶۵

ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، ایک لفظ حنّان ہے جو حنُّ سے نکلا ہے، حن اور حنین اس سوز دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ ان تمام الفاظ سے اللہ کی غیر معمولی رحمت و شفقت ظاہر ہوتی ہے۔

قرآن مجید نے جہاں یہ بتایا کہ کائنات کا مقتدر اعلیٰ رحیم و کریم ہے وہاں یہ بھی واضح کیا کہ وہ علم و حکمت کی صفات سے بھی متصف ہے بالفاظ دیگر جو ہستی اس عالم رنگ و بو پر حکمراں ہے وہ صرف رحیم ہی نہیں بلکہ بے اندازہ علیم و حکیم بھی ہے۔ فی الواقع اس کے اقتدار کی عمارت انہی دو ستونوں یعنی علم و رحمت پر قائم ہے۔ وہ جہاں اپنے وسیع علم کے ذریعہ عدل کامل کے ساتھ اس کائناتِ بے کراں کا انتظام و انصرام کرتا ہے اور اس کی ہر چھوٹی بڑی چیز پر نگاہ رکھتا ہے وہاں اپنی وسیع رحمت کی وجہ سے مخلوقات کے ساتھ حد درجہ مہربانی اور شفقت کا معاملہ کرتا ہے اور اس کا غیظ و غضب بھی جو بہت کم وقوع میں آتا ہے، دراصل اس کی رحمت ہی کا ایک حصّہ ہے اور اس میں بندوں کی فلاح مضمر ہوتی ہے۔ اس بات کو کہ علم ہی کے ذریعہ اللہ امور کائنات کی تدبیر کرتا ہے ایک سے زیادہ آیات میں بیان کیا گیا ہے مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے:

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝

(الحدید: ۳)

وہی اوّل ہے اور وہی آخر بھی، وہی ظاہر بھی وہی باطن بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

دوسری جگہ ہے:

اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ: ۹۸)

بے شک تمہارا الٰہ وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ اپنے علم سے تمام چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

ایک دوسری جگہ ہے:

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلٰهٌ وَّفِي الْأَرْضِ إِلٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ۝ (الزخرف: ۸۴)

وہی اللہ ہے جو آسمان میں بھی الٰہ ہے اور زمین میں بھی، اور وہ حکیم وعلیم ہے۔

الٰہ کے متذکرہ صفاتی تصوّر کو درج ذیل آیات میں بڑی وضاحت اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، فرمایا:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى ۚ يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (الحشر: ۲۲ تا ۲۴)

وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ پوشیدہ اور ظاہر دونوں کا جاننے والا ہے، وہ بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے، وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ بادشاہ ہے، پاک (ہر عیب ونقص سے) سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، سب پر غلبہ رکھنے والا اور اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا، بڑی عظمت والا، پاک ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں، وہ اللہ ہی ہے، پیدا کرنے والا، عدم سے وجود میں لانے والا، ٹھیک ٹھیک صورت گری کرنے والا، اس کے اچھے اچھے نام ہیں، آسمانوں اور زمین میں جو چیزیں ہیں سب اس کی پاکی بیان کرتی ہیں اور وہ زبردست اور حکمت والا ہے۔

مذکورہ آیات میں پہلی صفت علم اور دوسری صفت رحمت ہے اور ان دونوں کی وضاحت ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اس کے بعد تیسری صفت "الملک" ہے اس صفت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ علم ورحمت جس الٰہ کی بنیادی صفات ہیں وہی سارے جہاں

کا بادشاہ حقیقی یا دوسرے لفظوں میں مقتدر اعلیٰ ہے " الملک " سے متصل جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ بادشاہ حقیقی کے اس امتیازی وصف کو نمایاں کرتی ہیں کہ وہ اپنی بے مثال طاقت و قوت اور بے پایاں عظمت و شوکت کے باوجود دنیوی بادشاہوں کے برعکس اپنی مخلوقات کے لیے سراسر امن و سلامتی اور ان کا پناہ دہندہ اور کفیل و نگراں ہے (السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ) اس سے اگلی آیت میں صفت خلق کا ذکر ہوا ہے یعنی جو ہستی بادشاہ عالم ہے وہی اس کی خالق بھی ہے۔ یہ دراصل مشرکین کے اس غلط خیال کی تردید ہے کہ اس کائنات کا خالق اور اس کا فرماں روا دو جدا ہستیاں ہیں۔ آخر میں جن دو صفات کا ذکر ہوا ہے وہ عزیز اور حکیم ہیں۔ قرآن مجید میں تقریباً ہر جگہ ان کا ذکر الٰہ واحد کی صفات جامع کی حیثیت سے ہوا ہے مثلاً ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ (آل عمران : ٦)

وہ اللہ ہی ہے جو رحموں میں جس طرح چاہتا ہے تمھاری شکل و صورت بناتا ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ غالب و برتر اور حکیم ہے۔

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○

(آل عمران : ٦٢)

اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور بے شک اللہ ہی غالب و برتر اور حکمت والا ہے۔

ان آیات میں عزیز کے لفظ سے اللہ کے اقتدار اعلیٰ کی طرف اشارہ ہے کہ وہ زبردست طاقت و قوت رکھتا ہے اور حکیم کا لفظ اس کے بے نہایت علم و حکمت پر دلالت کرتا ہے۔ فی الواقع یہی دو لفظ یعنی عزیز اور حکیم الٰہ کے حقیقی مفہوم کو متعین کرتے ہیں باقی دوسرے مفہومات دراصل اس کی شرح و وضاحت ہیں گویا ہم جب

بھی اللہ تعالیٰ کا تصوّر کریں گے تو سب سے پہلے اس کے اقتدار — رحمت آمیز اقتدار — کا تصوّر پیدا ہوگا اور پھر علم وحکمت کا جس سے اقتدار کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ وہ دراصل علم ہے جو نہایت حکیمانہ ہے : وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا۔

الٰہ کے مفہوم کے تعیّن میں علمار کا اختلاف اور اس کے وجوہ

گذشتہ صفحات میں ہم نے الٰہ کے جس قرآنی تصوّر کی وضاحت کی ہے اس کو پڑھ کر ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب قرآن مجید نے الٰہ کے مفہوم کو واضح طور پر متعیّن کر دیا تھا تو پھر اس باب میں علمار کے درمیان اختلاف کیوں واقع ہوا اور کیا ان کے بیان کردہ مفہومات کو صحیح کہا جا سکتا ہے ؟

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن مجید نے الٰہ کے مفہوم کو قطعیت کے ساتھ متعین کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی تشریح میں جو اختلافات پیدا ہوئے تو اس کی وجہ دراصل علمار کے مخصوص ذہنی میلانات اور ان کے مذہبی رجحانات ہیں۔ ہر عالم نے الٰہ کے لغوی مفہومات میں سے صرف اس مفہوم کو لیا جو اس کے مخصوص ذہنی میلان اور ذوقِ مذہبی سے مطابقت رکھتا تھا اور اسی کی روشنی میں اس کی تشریح پیش کی۔ چنانچہ ہمارے جو علمار فلسفیانہ ذہن ومزاج رکھتے تھے انھوں نے الٰہ کو اَلِہَ یَاْلَہُ یعنی تحیّر کے معنی میں لیا یعنی الٰہ وہ ہستی ہے کہ اس کے بارے میں انسان جس قدر غور کرے گا اس کا نتیجہ تحیّر کے سوا اور کچھ نہ نکلے گا۔ اس گروہ علمار میں فلسفی صوفی بھی شامل ہیں۔ اس نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:[1]

> "اگر اللہ" اِلٰہ" سے ہے تو الٰہ کے معنی کیا ہیں؟ علمار لغت و اشتقاق کے مختلف اقوال ہیں مگر سب سے زیادہ قوی قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل اَلِہٌ ہے اور اَلِہَ کے معنی تحیّر اور درماندگی

---

[1] ترجمان القرآن، مطبوعہ ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی، ج ۱ (سورہ فاتحہ) ص ۱۸، ۱۹۔

کے ہیں۔ بعضوں نے اسے "ولہ" سے ماخوذ بتایا ہے اور اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ پس خالق کائنات کے لیے یہ لفظ اس لیے قرار پایا کہ اس کے بارے میں انسان جو کچھ جانتا ہے اور جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیّر اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ جس قدر بھی اس ذاتِ مطلق کی ہستی میں غور کرے گا اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی یہاں تک کہ وہ معلوم کرلے گا کہ اس راہ کی ابتدا بھی عجز و حیرت سے ہوتی ہے اور انتہا بھی عجز و حیرت ہی ہے ....
یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اس راہ میں عرفان و بصیرت کی کوئی بڑی سی بڑی بات کہی گئی وہ یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خود رفتگیوں کا اعتراف کیا گیا اور ادراک کا منتہی مرتبہ یہی قرار پایا کہ ادراک کی نارسائی کا ادراک حاصل ہو جائے۔ عرفاء کے دل و زبان کی صدا ہمیشہ یہی رہی کہ ربِّ زدنی فیك تحیرًا اور حکماء کی حکمت و دانش کا فیصلہ بھی یہی ہوا کہ ؎

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"

اس کے برخلاف وہ علماء جو صوفیانہ ذوق و مسلک رکھتے تھے اور عملاً بادۂ تصوف کے ذائقہ شناس تھے انھوں نے الٰہ کو "ولاہ" کے معنی میں لیا یعنی الٰہ وہ ہستی ہے جس کی طرف انسان مائل ہو، اس کا دل سے مشتاق ہو اور اس سے جان و دل سے محبت رکھتا ہو۔ اس طرز فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں[1]:

" اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے اس میں اہلِ لغت کا

---

[1] اسلام اور مستشرقین (مجموعہ مضامین سید سلیمان ندوی) مطبوعہ دار المصنفین، شبلی منزل اعظم گڈھ ۱۹۸۵، ج ۵ ص ۱۷

یقیناً اختلاف ہے مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ ولاہ سے نکلا ہے۔ ولاہ اور ولہ کے اصل معنی عربی اس غم، محبّت اور تعلق خاطر کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی سے بعد کو مطلق عشق و محبت کے معنی پیدا ہو گئے اس لیے اللہ کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں جس کے عشق و محبّت میں کائنات کے دل سرگرداں، متحیّر اور پریشان ہیں۔ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے۔ اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں موہن یعنی دلوں کا محبوب کہا کرتے تھے۔"

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی اسی گروہ صوفیاء سے تعلق رکھتے ہیں الٰہ کے متذکرہ مفہوم کی تائید میں انھوں نے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کے مشہور رسالۂ العبودیۃ" سے درج ذیل اقتباس اپنی کتاب" عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" میں نقل کیا ہے:[۱]

" الٰہ وہ ہے جس کی طرف دل کا میلان کمال محبّت اور نہایت تعظیم و احترام و اکرام، خوف و رجا اور اس طرح کی دیگر کیفیات کے ساتھ ہو۔"

تیسرا گروہ ان علماء کا ہے جو اسلام کا انقلابی تصوّر رکھتے ہیں اور ان کے طرز فکر پر اسلام کے سیاسی و اجتماعی تصوّرات کا غلبہ ہے اس لیے انھوں نے الٰہ کو مقتدر اعلیٰ اور حاکم علی الاطلاق کے معنی میں لیا ہے۔ اس مکتب فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:[۲]

" اقتدار اعلیٰ کی وحدانیت کا اقتضا یہ ہے کہ حاکمیت و فرماں روائی کی جتنی قسمیں ہیں سب ایک ہی مقتدر اعلیٰ کی ذات میں مرکوز ہوں

---

۱ رسالۃ العبودیۃ، ص ۱۲ بحوالہ" عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" مولانا ابوالحسن علی ندوی، مطبوعہ دار عرفات گوئن روڈ لکھنؤ۔ ۱۹۷۸ء ص ۵۸

۲ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں، ص ۲۴، ۲۵

اور حاکمیت کا کوئی جزو بھی کسی دوسرے کی طرف منتقل نہ ہو۔ جب خالق وہ ہے اور خلق میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، جب رازق وہ ہے اور رزق رسانی میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، جب پورے نظامِ کائنات کا مدبّر و منتظم وہ ہے اور تدبیر و انتظام میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں تو یقیناً حاکم و آمر اور شارع بھی اسی کو ہونا چاہیے اور اقتدار کی اس شق میں بھی کسی کے شریک ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جس طرح اس کی سلطنت کے دائرے میں اس کے سوا کسی دوسرے کا فریاد رس اور حاجت روا اور پناہ دہندہ ہونا غلط ہے اسی طرح کسی دوسرے کا مستقل بالذات حاکم اور خود مختار فرماں روا اور آزاد قانون ساز ہونا بھی غلط ہے۔ تخلیق اور رزق رسانی، احیا اور اماتت، تسخیر شمس و قمر اور تکویر لیل و نہار، قضا و قدر، حکم اور بادشاہی، امر اور تشریع سب ایک ہی کلی اقتدار و حاکمیت کے مختلف پہلو ہیں اور یہ اقتدار و حاکمیت ناقابلِ تقسیم ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے حکم کو واجب الاطاعت سمجھتا ہے تو وہ ایسا ہی شرک کرتا ہے جیسا ایک غیر اللہ سے دعا مانگنے والا شرک کرتا ہے اور اگر کوئی شخص سیاسی معنی میں مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ اور حاکم علی الاطلاق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا یہ دعویٰ بالکل اسی طرح خدائی کا دعویٰ ہے جس طرح فوق الطبیعی معنی میں کسی کا یہ کہنا کہ تمھارا ولی و کارساز اور مددگار و محافظ میں ہوں "

سید قطب بھی اسی خیال کے مؤید ہیں وہ لا الٰہ الا اللہ کی تشریح کرتے ہیں لکھتے ہیں[1]:

---

[1] سید قطب، معالم فی الطریق ص ۲۲ بحوالہ عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح ص ۴۷

"وہ جانتے تھے کہ لاالٰہ الا اللہ اس زمینی حاکمیت کے خلاف ایک بغاوت ہے جو الوہیت کے اخص خصائص کی غاصب ہے، اور ان نظاموں کے خلاف بغاوت ہے جو اس قبضۂ غاصبانہ پر قائم ہیں نیز ان تمام حکومتوں اور اقتداروں کے خلاف بغاوت ہے جو اس قانون کو جاری کرتے ہیں جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی"

آگے مزید لکھتے ہیں[1]:

"لاالٰہ الا اللہ کا مطلب ایک عرب کی نگاہ میں جو اپنی زبان کے الفاظ کے صحیح معنی و مفہوم سے واقف ہوتا ہے یہ ہے کہ حاکمیت صرف خدا کے لیے ہے اور شریعت صرف خدا کی تسلیم کی جائے گی اور کسی کو کسی پر حاکمیت کا حق حاصل نہیں کیونکہ حاکمیت کی تمام تر حقدار تنہا ذاتِ الٰہی ہے"

الٰہ کے ان تینوں مذکورہ بالا مفہومات میں سے اوّل الذکر مفہوم الٰہ کا فلسفیانہ تصوّر ہے جو عقلاء و حکماء کے ایک مختصر گروہ کے لیے باعث کشش ہو سکتا ہے لیکن عام اہل ایمان کے لیے اس تصوّر الٰہ میں کوئی خاص دلکشی و دل بستگی کا سامان موجود نہیں ہے، کیوں کہ جس ہستی مطلق کی ذات میں غور و فکر کا نتیجہ تحیّر و درماندگی کے سوا اور کچھ نہ ہو اس ذات سے کوئی صاحبِ ایمان کیونکر اپنے ذہن و قلب کا تعلق قائم کر سکتا ہے اور اس کو اپنے بہترین احساسات و جذبات کا مرکز بنا کر اس کی اطاعت و بندگی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت سے بھی اس تصوّر الٰہ کی تائید نہیں ہوتی خود مولانا ابوالکلام آزاد نے اس تصوّر الٰہ کی تشریح و توضیح میں اپنے خامۂ سحر طراز کے جوہر خوب دکھائے ہیں لیکن اس تصوّر کی تائید میں وہ لغت کے علاوہ کوئی قرآنی آیت پیش نہیں کر سکے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ یہ ایک خالص فلسفیانہ تصوّر الٰہ ہے،

---

[1] معالم فی الطریق ص ۲۵ بحوالہ عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح ص ۴۸

قرآن مجید کے تصوّر الٰہ سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

الٰہ کے ثانی الذکر مفہوم کی تائید بلاشبہ اللہ کے ان صفاتی ناموں سے ہوتی ہے جن کا ذکر قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر آیا ہے، لیکن یہ مفہوم الٰہ کے متعدد صفاتی مفہومات میں سے ایک ہے اسے اس کا کلّی مفہوم قرار نہیں دیا جا سکتا ہے جیسا کہ ہم الٰہ کے صفاتی تصوّر کی بحث میں واضح کر چکے ہیں۔

الٰہ کا مؤخر الذکر مفہوم قرآن مجید کے تصوّر الٰہ سے زیادہ قریب ہے لیکن اس میں جو سب سے بڑی کمی ہے وہ یہ کہ اس میں الٰہ کے صفاتی تصوّر سے بحث نہیں کی گئی ہے جس کو قرآن مجید نے اپنی بے شمار آیتوں میں بتکرار بیان کیا ہے۔ اس لیے اس تصوّر کو بھی ہم الٰہ کا جامع قرآنی تصوّر نہیں کہہ سکتے ہیں۔

اس گروہ سے تعلق رکھنے والے علماء نے اس تصوّر کو اس زور و شدت سے ابھارا ہے کہ یہی الٰہ کا کُلّی مفہوم بن کر رہ گیا ہے، دوسرے لفظوں میں اس کا جو سیاسی مفہوم تھا وہ اس کے دوسرے مفہومات پر حاوی ہو گیا ہے۔ اسی لیے بعض علماء نے اسے الٰہ کی سیاسی تعبیر قرار دیا ہے۔ ہم اسے الٰہ کی سیاسی تعبیر تو نہیں کہہ سکتے لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ اس میں مبالغہ ہے۔ جو لوگ الٰہ کے تمام مفہومات سے واقف نہ ہوں گے وہ لازماً اس کو الٰہ کا کل مفہوم سمجھ لیں گے اور اسی کی روشنی میں دین کی تشریح و تعبیر کریں گے۔ اس پر مزید گفتگو توحید کے تشریعی تقاضوں کے بیان میں ملے گی۔

اللہ اور اس کے بندوں میں تعلق کی نوعیت

اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے یہ بھی ایک اہم اختلافی مسئلہ ہے جو علماء الٰہ کو مقتدر اعلیٰ کے معنی میں لیتے ہیں ان کے نزدیک اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان تعلق کی نوعیت حاکم و محکوم اور آقا و غلام کی سی ہے یعنی اللہ اس کائناتِ بے کراں کا حاکم علی الاطلاق اور مقتدر اعلیٰ ہے اور انسان اس سلطان موجودات اور حاکم بحر و بر کی رعیّت ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اللہ اور اس کے بندوں

کے درمیان اسی نوع کے تعلق کی نشاندہی کی ہے، لکھتے ہیں[1]:

"جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیے ہیں اور ان کے درمیان مقصد و نوعیت کے اعتبار سے فرق کیا ہے، انھوں نے سخت غلطی کی ہے، مالک الملک کی طرف سے اس کی رعیت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خود مختاری سے روکے اور شرک (یعنی اس بات سے کہ وہ مقتدر اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں تقسیم کریں) سے منع کرے اور اصل مالک کی خالص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔"

ہمارے بعض علماء نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا ہے کہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان تعلق کی نوعیت محض حاکم و محکوم کی ہے بلکہ یہ تعلق اس سے کہیں زیادہ وسیع اور گہرا ہے یعنی محب اور محبوب جیسا گہرا تعلق۔ اس سلسلے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں[2]:

"مصنف کی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" اور ان کی بکثرت تحریروں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ اور انسان کے درمیان کا اصل تعلق اور رشتہ حاکم و محکوم کا رشتہ اور رعیت و حکومت کا تعلق ہے اور اللہ کے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ عالیہ میں اصل حیثیت اس کے مقتدر اعلیٰ اور حاکم علی الاطلاق ہونے کی ہے ..... درحقیقت خالق و مخلوق اور عبد و معبود کا تعلق حاکم و محکوم اور آمر و مامور

---

[1] تفہیم القرآن، ج ا ص ۲۵۵، شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی ۱۹۶۹ء

[2] عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح ص ۵۳

اور ایک بادشاہ اور رعیت کے تعلق سے کہیں زیادہ وسیع، کہیں زیادہ عمیق، کہیں زیادہ لطیف اور کہیں زیادہ نازک ہے، قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے اسماء، وصفات کو جس تفصیل کے ساتھ اور جتنے دل آویز طریقہ پر بیان کیا ہے اس کا مقصد قطعاً یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بندہ سے صرف اتنا مطلوب ہے کہ وہ اس کو اپنا حاکم اعلیٰ اور آمر مطلق سمجھ لے اور اس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہ کرے۔"

آگے اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کی صحیح نوعیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں[1]:

"ان اسماء، وصفات اور ان افعال الٰہی کے ذکر کا جن سے قرآن شریف بھرا ہوا ہے، صاف تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے دل وجان سے محبت کی جائے، اس کی طلب ورضا میں جان کھپا دی جائے، اس کی حمد وثنا کے گیت گائے جائیں، اٹھتے بیٹھتے اس کے نام کا وظیفہ پڑھا جائے، اس کی دھن ہر وقت دل ودماغ میں سمائی رہے، اسی کے خوف سے انسان ہر وقت لرزاں اور ترساں رہے، اسی کے سامنے دست طلب ہر وقت پھیلا رہے، اسی کے جمال جہاں آرا پر ہر وقت نگاہیں جمی رہیں، اسی کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے.... مٹا دینے حتیٰ کہ سر کٹا دینے کا جذبہ بیدار رہے، جن لوگوں نے اس کے صفات اور استحقاقات میں سے صرف اس کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ ہی کو اس کا اصل حق اور مطالبہ سمجھا، ڈر ہے کہ کہیں وہ " وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ " کے مصداق نہ بنیں۔"

مذکورہ اقتباس میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اللہ تعالیٰ کے اسماء، وصفات

---

[1] عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح ص ۵۴

کے جو تقاضے بیان کیے ہیں اس کی شاعرانہ زبان و بیان سے قطع نظر اس سے اتنا بالکل واضح ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مقتدر اعلیٰ اور حاکم علی الاطلاق کے بجائے محبوب حقیقی کا درجہ دیتے ہیں۔ اس تصوّر کے مطابق لازماً اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان تعلق کی نوعیت محب اور محبوب کی بنتی ہے۔

راقم سطور کے نزدیک دونوں نقطہ ہائے نظر میں افراط اور غلو پایا جاتا ہے۔ قرآن مجید کا نقطۂ نظر اس باب میں بالکل واضح ہے۔ وہ صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ اللہ ہی انسانوں کا خالق و مالک اور بادشاہ حقیقی ہے۔ قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر جیساکہ پہلے بیان ہوچکا ہے، اللہ کے لیے "مَلِک" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور جب وہ بادشاہ حقیقی ہے تو لازماً اس کی مخلوق کی حیثیت رعیّت کی ہوگی[۱] اور اس کا فرض منصبی دل کی پوری رضا و رغبت کے ساتھ اس کے احکام کو بجالانا ہوگا جیساکہ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ○ (الانعام: ۱۰۳)

یہ ہے اللہ تمہارا رب اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں، ہر چیز کا خالق اس لیے اسی کی اطاعت و بندگی کرو، بے شک وہ ہر چیز کا کارساز ہے۔

دوسری جگہ ہے:

سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ○ (البقرة: ۱۱۶)

وہ پاک ہے اس شرک سے، حقیقت واقعہ یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں جو شے بھی ہے اس کی مِلک ہے، سب اس کے تابع فرمان ہیں۔

---

[۱] یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مطیع و فرماں بردار انسانوں کے لیے قرآن مجید نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ عبد ہے جس کے معنی غلام کے ہیں: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ (البقرة: ۱۸۶)

ایک اور مقام پر ہے :

وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِينَ ○ (البقرۃ : ۲۳۸)

اللہ کے آگے غلامانہ کھڑے رہو۔

لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ دنیوی بادشاہوں کی طرح نہیں ہے جو بالعموم اپنی رعیّت کے ساتھ سنگ دلی، بے مروتی اور ظلم و استبداد کا معاملہ کرتے ہیں۔ اللہ ان تمام عیوب سے پاک ہے وہ نہایت مہربان، رحم دل اور شفیق بادشاہ ہے، اپنی مخلوقات سے بے پناہ محبّت کرتا ہے، ان کی خطاؤں اور لغزشوں سے ایک دو بار نہیں، ہزاروں بار درگذر کرتا ہے اور ان کی سرکشی کے باوجود انھیں رزق عطا کرتا ہے۔

ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ جو بادشاہ نرم دل ہوتا ہے اور اپنی رعایا کا سچّا بہی خواہ اور نگہبان، بھی اس کی رعایا اس سے دلی محبت کرتی ہے، اس کے گن گاتی ہے اور اس کے احکام کو خوشی سے بجالاتی ہے۔ یہ قلبی اطاعت ہے۔ لیکن اگر حاکم اس کے برعکس ہوتا ہے تو رعایا اس سے نفرت کرتی ہے اور اس کی برائیاں بیان کرتی ہے لیکن اس نفرت و عیب جوئی کے باوجود بادل نخواستہ اس کے احکام پر عمل کرتی ہے کیونکہ حکم عدولی کی صورت میں جان و مال کے ضیاع کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اسی کا نام جبری اطاعت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دنیا میں جبری اطاعت کے لیے نہیں بلکہ قلبی اطاعت کے لیے پیدا کیا ہے " وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ " میں عبادت سے مقصود یہی قلبی عبادت ہے۔ اس قلبی عبادت کی حقیقت کیا ہے اس کو بھی سمجھ لیں۔

اس کائنات کی جملہ اشیاء، اپنے خالق و مالک کے بنائے ہوئے قانون کا بے چون و چرا اتّباع کر رہی ہیں۔ یہ دراصل ان کی طبعی سرشت کا لازمی تقاضا ہے، ان کی فطرت ہی میں اطاعت کی خو رکھ دی گئی ہے اس لیے وہ کسی حال میں بھی اس کے قوانین سے سرمو بھی انحراف نہیں کر سکتی ہیں۔ انسان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو دوسری مخلوقات کی طرح اس کو بھی ہر پہلو سے پابند قانون کر دیتا لیکن اس نے

ایسا نہیں کیا بلکہ اسے اس امر میں آزادی دی کہ وہ چاہے تو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کے احکام وقوانین کی پیروی کرے اور چاہے تو اس کے خلاف کرے: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (الدھر: ۳) "ہم نے اسے راستہ دکھایا ہے خواہ وہ اس کا شکر بجا لائے اور خواہ ناشکری کرے۔"

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ اگر وہ اپنی خوشی سے اس کے قوانین کی اتّباع کرے گا یعنی قلبی اطاعت تو دنیا میں بھی کامراں ہوگا اور آخرت میں بھی اسے سرخروئی ملے گی لیکن نافرمانی کی صورت میں دنیا اور آخرت دونوں میں ناکامی ونامرادی سے دوچار ہوگا۔

اسی بنا پر بادشاہ حقیقی یعنی اللہ کو اپنی رعایا یعنی بندوں سے جس نوع کی اطاعت مطلوب ہے وہ جبری نہیں بلکہ اختیاری اطاعت ہے جس میں دل کی پوری رضا ورغبت شامل ہو، جس میں جسم کے ساتھ دل بھی جھکے دوسرے لفظوں میں جس میں والہانہ محبت کی سرشاری پائی جائے یہی تخلیق انسان کی غایت ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں:[۱]

> "شریعت کے احکام کے ساتھ ہمارا بالکل وہ مذہب ہونا چاہیے جو عاشق کا معشوق کے ساتھ اور مملوک یا غلام کا اپنے مالک کے ساتھ ہوتا ہے۔ کسی نے ایک غلام خریدا اور اس سے پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے، کہا جو آپ مقرر کریں، پھر پوچھا کہ تو کیا کھایا کرتا ہے، کہا آپ جو کھلائیں، اسی طرح لباس کے متعلق سوال کیا تو جواب دیا کہ جو آپ پہنائیں .... تو کیا خدا کے ساتھ جو علاقہ ہے وہ غلامی نہیں، بلکہ اگر غور کرو تو خدا کے ساتھ تو ہم کو حقیقی غلامی کا تعلق ہے۔ انسانی غلامی سے تو انسان آزاد بھی ہو سکتا ہے برخلاف خدا کی غلامی کے کہ اس کا طوق ہماری

---

[۱] مولانا اشرف علی تھانوی، الرفیق ص ۱۵۹ بحوالہ تجدید تصوف وسلوک، مولانا عبدالباری ص ۱۹۸

گردن سے کبھی نہیں نکل سکتا .....

پس معلوم ہوا کہ دنیا میں اس کو جس بات کے حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے وہ یہی عبدیت کی حالت ہے یعنی دنیا میں انسان کو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ اوامر و نواہی کو پورا کر کے عبدیت حاصل کرے۔"

رب

توحید کے نقطۂ نظر سے رب کی قرآنی اصطلاح بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا کہ پہلے اس کے لغوی معانی بیان کر دیے جائیں تاکہ اس کی روشنی میں اس کے توحیدی مفہوم کو متعیّن کیا جا سکے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ الٰہ کی طرح رب کے لغوی معانی کے تعیّن میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔

لغوی معانی

راقم سطور نے اپنی کتاب "سورہُ فاتحہ، ایک تحقیقی مطالعہ" میں رب کے لغوی معانی کو تفصیل سے بیان کیا ہے یہاں ان کو مزید تحقیقی اضافوں کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

رب کا لفظ اصل میں رب یربُّ کا مصدر ہے جس کے اصل معنی تربیت کے ہیں اور پھر مبالغہ کے لیے عدل کی طرح بطور وصف استعمال کیا جانے لگا۔ امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ رب مصدر ہے۔ جو فاعل کے لیے مستعار ہے، تربیت کی تعریف انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے[1]:

هو انشاء الشئ حالاً فحالاً الی حد التمام

کسی چیز کو درجہ بدرجہ اس طرح نشو و نما دیتے رہنا کہ وہ حد کمال کو پہنچ جائے۔

ربّ ولده (الصبيّ يُربُّه ربًّا (ربّاه) کے معنی ہیں کہ اس نے بچّے کی عمدہ پرورش و تربیت کی، نگرانی کی یہاں تک کہ وہ طفولیت کی حد سے نکل کر بالغ ہو گیا،

---

[1] المفردات فی غریب القرآن ص ۱۸۲ مطبوعہ مصر

حسان بن ثابت کا شعر ہے :

مِن دُرّۃٍ بیضاء صافیۃ　　　ممّا تربّب حائر البحر[۱]

" ممدوح اس صاف اور سفید موتی سے بھی زیادہ خوبصورت ہے جس نے سمندر کی گہرائی میں پرورش پائی "

اسی سے ایک لفظ الربّہ ہے اور اس کا اطلاق ان پودوں پر ہوتا ہے جو گرمیوں میں بھی مرجھاتے نہیں ہیں بلکہ ان کی سرسبزی و تازگی سردی اور گرمی دونوں میں قائم رہتی ہے اور یہ نشوونما کا لازمی نتیجہ ہے۔ ربیبہ اس لڑکی کو کہتے ہیں جو سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائے، رابّہ سوتیلی ماں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ماں نہ ہونے کے باوجود بچّے کی پرورش کرتی ہے، اسی معنی میں سوتیلے باپ کو رابّ کہتے ہیں، اسی طرح وہ بکری جسے چراگاہ میں نہ بھیجا جائے بلکہ گھر پر چارہ دے کر اسے پرورش کیا جائے، ربیبہ کہلاتی ہے۔[۲]

امام راغب اصفہانی کی پیروی میں جن کا قول ہم اوپر نقل کر چکے ہیں، اکثر علماء نے رب کو پرورش کنندہ کے معنی میں لیا ہے۔ امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں امام حلیمی کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:[۳]

قال الحلیمی رحمہ اللہ فی معنی الرب ھو للمبلغ کل ما ابدع حد کمالہ الذی تدرہ فھو یسل النطفۃ من الصلب ثم یجعلھا علقۃ ثم العلقۃ مضغۃ ثم یخلق المضغۃ عظماً ثم یکسو العظام لحماً ثم یخلق فی البدن الروح ویخرجہ خلقاً اٰخر وھو صغیر ضعیف فلا یزال ینمیہ وینشیہ

---

۱ تاج العروس، مطبوعہ کویت ۱۹۶۶ء ج ۲ ص ۴۶۵

۲ تاج

۳ کتاب الاسماء والصفات، مطبوعہ مطبع انوار احمد الٰہ آباد ص ۵۶

حتیٰ یجعله رجلاً ویکون فی بدء امره شاباً ثم یجعله کهلاً ثم شیخاً وھٰکذا کل شیٔ خلقه فهو القائم علیه وللمبلغ ایاه الحد الذی وضعه له وجعله نهایة ومقدارا له

"حلیمی نے رب کے معنی بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ رب وہ ہے جو ہر اس چیز کو جسے اس نے پیدا کیا ہے اس حد کمال تک پہنچا دیتا ہے جو اس نے اس کے لیے مقرر کی ہے پس وہ نطفہ کو پشت سے نکالتا ہے پھر اس کو علقہ بناتا ہے پھر اس علقہ کو مضغہ بناتا ہے پھر اس سے ہڈیاں پیدا کرتا ہے پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھاتا ہے پھر بدن میں روح ڈالتا ہے اور اس کو ایک نئی صورت میں جبکہ وہ ایک ناتواں بچہ ہوتا ہے، نکال کھڑا کرتا ہے پھر اس کو مسلسل نشوونما دیتا ہے یہاں تک کہ اسے پورا آدمی بنا دیتا ہے، ابتدا میں وہ جوان ہوتا ہے پھر اس کو ادھیڑ بنا دیتا ہے اور پھر بوڑھا۔ جو چیز بھی اس نے پیدا کی ہے سب کی نشوونما کا آغاز و انجام اسی طریق پر انجام پاتا ہے۔ پس رب وہ ہے جو اس کو اس حد پر پہنچانے والا ہے جو حد کہ اس نے اس کے لیے مقرر کی ہے اور اس کی نہایت و مقدار قرار دی ہے۔"

رب کے ایک دوسرے معنی آقا، مالک اور سردار کے ہیں، لیکن یہ اس کے ثانوی مفہومات ہیں جو تقاضائے پرورش کے طور پر اس میں شامل ہو گئے ہیں، اور اب ان ثانوی مفہومات نے اس کے اصل مفہوم کی حیثیت اختیار کر لی ہے جیسا کہ کتبِ لغت کی تشریحات سے معلوم ہوتا ہے، لسان العرب میں ہے:[1]

"رب کل شیٔ: مالکه ومستحقه، وقیل: صاحبه، ویقال: فلان ربُّ هذا الشیٔ ای ملکه له، وکل من ملك شیئًا فهو ربه، یقال: هو رب الدابّة ورب الدار"

ہر چیز کا رب یعنی اس کا مالک اور اس کا مستحق یا اس کا صاحب، کہا جاتا ہے: فلاں اس چیز کا رب ہے یعنی اس کی ملکیت میں ہے، جو کسی چیز کا مالک

---

[1] لسان العرب، بذیل مادہ رب

ہے وہ اس کا رب ہے، کہا جاتا ہے: وہ جانوروں کا رب یعنی اس کا مالک ہے، فلاں گھر کا رب یعنی مالک ہے۔"

تاج العروس میں اس کے درج ذیل معنی لکھے ہیں[1]:

"رب کل شئ: مالکه ومستحقه اوصاحبه، یقال: فلان ربّ هذا الشئ أی مِلکه له، وکل من ملك شیئًا فهو ربه، یقال: هو ربّ الدابة وربّ الدار و فلانة ربّة البیت وهنّ ربّات الحجال وفی حدیث اشراط الساعة "أن تلد الأمة ربّتها وربّها" اراد به المولیٰ والسید یعنی اَنّ الاَمَة تلدُ لسیدها ولدًا فیکون کالمولیٰ لها لانه فی الحسب کابیه - وفی حدیث اجابة الدعوة "اللّهم ربّ هٰذه الدعوة"۔"

"ہر چیز کا رب یعنی اس کا مالک، کہا جاتا ہے: فلاں اس چیز کا رب ہے یعنی وہ اس کی ملکیت میں ہے، جو شخص کسی چیز کا مالک ہے وہ اس کا رب ہے۔ کہا جاتا ہے: ربّ الدابّة (جانور کا مالک) ربّ الدار (گھر کا مالک) ربّة البیت (گھر کی مالکن) ربّات الحجال (پردہ نشین عورتیں) قرب قیامت کی علامات والی حدیث میں ہے: لونڈی ربّة اور رب جنے گی، مراد آقا اور سید ہیں، مطلب یہ ہے کہ لونڈی اپنے آقا کے لیے بچہ جنے گی اور وہ بھی اس کے لیے آقا کی طرح ہوگا کیونکہ وہ حسب میں باپ کی مثل ہوگا۔ قبول دعوت کی حدیث میں ہے: اے اللہ اس دعوت کے رب یعنی صاحب دعوت۔"

تاج العروس ہی میں ابو منصور کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ لغت میں رب کے معنی

---

[1] تاج العروس، مطبوعہ کویت ۱۹۶۶ء ج ۲ ص ۴۶۰

مالک، سید، مدبّر، مربّی اور متمّم کے ہیں اور ابن الانباری کا یہ قول بھی درج ہے کہ رب کے تین معنی ہیں، ایک مالک دوسرے سیّد جس کی اطاعت کی جائے اور تیسرے مصلح[۴]، سید مطاع کے معنی میں لبید بن ربیعہ کا شعر ہے:

واھلکن رب کندہ[۲] وابنہ وربّ معدٍ بین خبت وعرعر[۳]

رب کے مذکورہ مفہومات کی تائید بعض علماء کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے، امام بیہقی نے امام خطابی کے حوالے سے لکھا ہے:

"بہت سے مفسّرین کا خیال ہے کہ آیۂ کریمہ الحمد للّٰہ رب العٰلمین میں رب کے معنی سید یعنی آقا و سردار کے ہیں اور یہ معنی اس وقت درست ہو سکتے ہیں جب ہم عالمین کے معنی جماد کو چھوڑ کر ذوی العقول کے لیں کیونکہ جس طرح سیّد الناس کہا جاتا ہے اس طرح سیّد الجبال والشجر کہنا درست نہیں ہے اور اسی معنی میں ارشاد ہے: اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ط (یوسف: ۵۰) اپنے آقا کے پاس جاؤ اور ان عورتوں کے معاملے میں پوچھو جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے" اس آیت میں رب کے معنی سید یعنی آقا کے ہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ رب کے معنی مالک کے ہیں[۶]"

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں لکھا ہے کہ رب کے اصل معنی تو پرورش

---

۱ تاج العروس ج ۲ ص ۴۰۹، ۳۶۴

۲ رب کندہ سے شاعر کی مراد حجر ابو امرئ القیس اور رب معد سے حذیفہ بن بدر ہیں۔

۳ خبت و عرعر دونوں جگہ کے نام ہیں (تفسیر طبری ج ۱ ص ۱۳۷)

۴ تاج العروس ج ۲ ص ۴۵۹

۵ ایضاً ص ۳۶۶

۶ کتاب الاسماء والصفات ص ۵۶

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں لکھا ہے کہ رب کے اصل معنی تو پرورش کے ہیں لیکن اس کے دوسرے ثانوی مفہومات کو جو پرورش کے لازمی تقاضے کے طور پر پیدا ہوگئے ہیں، نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، فرماتے ہیں[1]:

"اللہ کی طرح رب بھی سامی زبانوں کا ایک کثیر الاستعمال مادہ ہے۔ عبرانی، سریانی اور عربی تینوں زبانوں میں اس کے معنی پالنے کے ہیں اور چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے اس لیے اسے بھی قدیم ترین سامی[2] تعبیرات میں سے سمجھنا چاہیے پھر چونکہ معلّم، استاد اور آقا کسی نہ کسی اعتبار سے پرورش کرنے والے ہی ہوتے ہیں اس لیے اس کا اطلاق ان معنوں میں بھی ہونے لگا چنانچہ عبرانی اور آرامی کا "ربّی" اور "ربّاہ" پرورش کنندہ، معلم اور آقا تینوں معنی رکھتا ہے اور قدیم مصری اور خالدی زبان کا لفظ "رابو" بھی انھیں معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ بہرحال عربی میں ربوبیت کے معنی پالنے کے ہیں لیکن پالنے کو اس کے وسیع معنوں میں لینا چاہیے۔"

رب کے اندر اجتماع، اصلاح اور کفالت و خبرگیری جیسے ثانوی مفہومات بھی پائے جاتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں: ربّت السحابة بهذا البلد "بدلی برابر اس شہر پر ٹھہری رہی یا برستی رہی (تاج) ربابہ اس تھیلے کو کہتے ہیں جس میں بہت سے تیروں کو اکٹھا کر کے رکھا جائے (تاج) رباب و مربّہ: اس زمین کو کہتے ہیں جہاں درخت اور پودے بکثرت ہوں (تاج) الربّة اس بڑی جماعت کو کہتے ہیں جو دس ہزار یا اس کے

---

[1] ترجمان القرآن، مطبوعہ ساہتیہ اکاڈمی دہلی ۱۹۷۶ء ج ۱ ص ۱۸

[2] سامی زبانوں میں رب کے معنی بڑے کے ہیں، صابئیوں کے مذہبی صحیفے کے ایک حصّے کا نام سدرہ ربہ ہے یعنی بڑی کتاب۔ دیکھیں تاریخ ارض القرآن ج ۲ ص ۲۰۵

لگ بھگ ہو (تاج) المرَبّ اس آدمی کو کہتے ہیں جو لوگوں کو اکٹھا کرے اور ان کو بڑھائے (تاج) مکان مَرَبّ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں لوگ جمع ہوں یعنی اجتماع گاہ (لسان العرب) الرَّبابَة اس بادل کو کہتے ہیں جو تہ بہ تہ جمع ہو، اس کی جمع رَباب ہے (تاج) الرَّبِیبُ اس شیریں پانی کو کہتے ہیں جو کثرت سے ایک جگہ جمع ہو گیا ہو (تاج)۔

اسی طرح رَبّ الدھن کے معنی ہیں اس نے تیل کی اصلاح کی اور اسے خوشبودار بنایا (محیط) ادیم غیر مربوب اس چمڑے کو کہتے ہیں جسے دباغت دے کر درست نہ کیا گیا ہو۔ رَبّ ضیعتہ کے معنی ہیں، فلاں شخص نے اپنی جائداد کی نگرانی کی، علقمہ بن عبیدہ کا شعر ہے:

نکنت امرًا افضت الیک ربابی وقبلك ربّتنی فضعت ربوبی

"تجھ سے پہلے جو شخص میرا کفیل تھا اس نے قطعاً میری خبرگیری نہ کی اور آخر الامر اب میری کفالت وربابت کی ذمہ داری تمہارے سپرد ہوئی ہے"

قد ربّ فلان قومہ کے معنی ہیں، فلاں شخص نے اپنی قوم کو تابع فرمان بنا لیا، ربَبتُ القومَ یعنی میں نے قوم پر حکم چلایا۔

رب کی متذکرہ بالا لغوی تشریحات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لفظ حسب ذیل معانی رکھتا ہے:

(۱) پرورش کرنے والا، کفیل ونگران۔

(۲) وہ جس کے گرد لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوں یعنی آقا وسردار۔

(۳) وہ جس کا حکم لوگوں پر چلے اور لوگ اس کے حکموں کی اتباع کریں یعنی حاکم وبادشاہ۔

قرآنی معنی

قرآن مجید میں رب کا لفظ اس کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ اس کا احاطہ مشکل ہے۔ ان میں سے اکثر مقامات کا گہری نظر سے جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید

نے اسے متذکرہ بالا تینوں معنوں میں استعمال کیا ہے یعنی کہیں کفیل و نگراں کے معنی میں، کہیں آقا و مالک کے معنی میں اور کہیں حاکم و بادشاہ کے معنی میں۔

قرآن مجید میں جہاں یہ لفظ غیر اللہ کے لیے استعمال ہوا ہے وہاں اس کے معنی واضح طور پر آقا و حاکم کے ہیں مثلاً سورۂ یوسف میں ایک جگہ ہے: فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ (آیت ۵۰) "پس جب قاصد اس کے پاس آیا تو اس نے (یوسف) کہا: واپس اپنے آقا کے پاس جاؤ اور اس سے معلوم کرو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔" دوسری جگہ ہے: فَاَنْسٰهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ (آیت ۴۲) "پھر شیطان نے اس کو بھلا دیا کہ وہ اپنے آقا سے اس کا ذکر کرے جس کے نتیجے میں وہ چند سال اور قید میں پڑا رہا۔"

ہمارے اکثر علماء و مفسّرین نے رب کے صرف لغوی معنی بیان کیے ہیں یعنی مربّی، بعض نے آقا و سردار کے معنی بھی لکھے ہیں، لیکن اس کے اصطلاحی معنی (حاکم علی الاطلاق) سے کم ہی علماء نے بحث کی ہے حالانکہ قرآن مجید میں یہ لفظ اصطلاحی معنی میں اس کے لغوی معنی سے کہیں زیادہ استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید نے ایک سے زیادہ مقامات پر اس کے اصطلاحی مفہوم کی وضاحت بھی کر دی ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○

(الزُّمَر: ٦)

یہ ہے اللہ تمھارا رب (آقا و حاکم)، بادشاہی اسی کی ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں پھر تم کہاں پھرائے جا رہے ہو۔

اس آیت میں "لَهُ الْمُلْكُ" کا جملہ رب کی وضاحت کے لیے آیا ہے یعنی اللہ ہی انسانوں کا بادشاہ حقیقی ہے، طاقت و قوت بس اسی کے ہاتھ میں ہے۔ "لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" کا یہی مفہوم ہے۔ یہ بھی وضاحتی جملہ ہے۔ انسان اسی کو اپنا رب بناتا ہے جو اس کی

نظروں میں صاحبِ طاقت و قوت ہوتا ہے۔ جو کسی کو نفع و نقصان نہ پہنچا سکے وہ کسی حال میں بھی رب نہیں کہلا سکتا ہے۔ ربوبیت اور اقتدار لازم و ملزوم ہیں۔ اسی لیے آیۂ محوّلہ بالا میں کہا گیا ہے کہ جو اللہ انسانوں کا رب یعنی بادشاہ حقیقی ہے اسی کے ہاتھ میں جملہ اقتدار و اختیار بھی ہے اس کے علاوہ کسی اور کے پاس شمّہ برابر بھی اقتدار و اختیار نہیں ہے اس لیے ان کو رب قرار دینا انسانوں کی کھلی ہوئی نادانی ہے۔ اسی بات کو آیت ذیل میں اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، فرمایا:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝ (فاطر: ۱۳)

یہ ہے اللہ تمہارا رب، بادشاہی اسی کی ہے اور اس کے سوا جن کو تم (حاجات و بلایا میں مدد کے لیے) پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے بھی مالک نہیں (یعنی بالکل عاجز و بے اختیار ہیں)۔

قرآن مجید کا تصوّر ربوبیت

دنیا کی تقریبًا ہر قوم خالقِ کائنات کی حیثیت سے ایک بلند و برتر ہستی کو مانتی رہی ہے۔ اہلِ عرب بھی اس بلند ہستی کے قائل تھے اور اس کو تمام اعلیٰ صفات و کمالات سے متّصف سمجھتے تھے۔ ہم اس سلسلے میں چند آیات پہلے نقل کر چکے ہیں یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کرتے ہیں، فرمایا گیا ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝

(العنکبوت: ۶۱)

اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا ہے؟ تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر وہ کدھر اُلٹے پھرائے جا رہے ہیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کا خالق اللہ ہی کو مانتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اللہ ہی کو رازق اور موت و زندگی دینے والا بھی سمجھتے تھے (یونس: ۳۱) لیکن اس کے ساتھ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ آسمانوں اور زمین کی وسیع سلطنت کا نظام چلانے میں اللہ کے ساتھ کچھ مخلوق ہستیاں بھی شریک ہیں۔ ان شرکاء میں فرشتے، ستارے اور گزرے ہوئے صالح و نیکوکار انسان خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ان کے متعلق وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ اللہ کی طرف سے انتظامِ کائنات پر مامور ہیں، ان کے حاجت روا ہیں اور آفات میں اُن کی مدد کرتے ہیں۔

یہی اعتقاد دوسری مشرک قومیں بھی رکھتی تھیں۔ قرآن مجید نے مشرکینِ عالم کے اس غلط خیال کی تردید کی اور انھیں بتایا کہ جو ذات خالق کائنات ہے وہی اس کی ناظم و آمر بھی ہے[1]۔ کوئی مخلوق کسی درجہ میں بھی انتظامِ کائنات میں شریک نہیں

---

[1] ہمارے اکثر علماء و مفسّرین نے ربوبیت کی تشریح میں صرف اللہ تعالیٰ کی پروردگاری کے پہلو کو لیا ہے یعنی وہ اللہ ہی کی ذات ہے جو ہر شئے کی پیدائش (تخلیق) اس کی نشوونما اور اس کو حدِ کمال تک پہنچانے کی ذمّہ دار ہے۔ اسی کے نظامِ ربوبیت کے تحت ایک پودا زمین کے اندر سے آغوشِ تخم سے نمودار ہوتا ہے، نشوونما پاتا ہے اور پھل پھول لاتا ہے۔ نشوونما کے اس سارے مرحلہ میں صرف اللہ کا دستِ ربوبیت کارفرما ہوتا ہے۔ یہی حال کائنات کی ہر چیز کا ہے۔ ربوبیت کے اس پہلو کا سب سے اعلیٰ مظہر انسان ہے۔

کائناتی ربوبیت کا یہ پہلو اس درجہ نمایاں ہے کہ کوئی بھی صاحبِ عقل و ہوش انسان اس کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مشرکین عرب بھی اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے اور اس کو تسلیم کرتے تھے۔ قرآن مجید میں ربوبیت کے اس پہلو کو جہاں بھی نمایاں کیا گیا ہے اس کی غرض اثباتِ ربوبیت نہیں جیسا کہ علماء نے سمجھا ہے بلکہ تقاضائے ربوبیت کا اثبات ہے۔ یعنی ان کی بنیاد پر ان سے سوال کیا گیا ہے کہ جب اللہ ہی تمہارا خالق و رازق اور محسنِ حقیقی ہے تو پھر تم اپنا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہے، فرمایا:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (الاعراف:۵۴)

سُن لو خلق بھی اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔ بڑی عظمت والا ہے اللہ جو سارے جہانوں کا پروردگار، آقا اور حاکم ہے۔

قرآن مجید نے صرف اللہ کی حاکمیت (امر) ہی کا اعلان نہیں کیا بلکہ مخلوقات بالخصوص اجرامِ سماویہ کی ربوبیت (حاکمیت) کے مشرکانہ تصوّر کی بیخ کنی کے لیے یہ بھی بتایا کہ ان کی حیثیت حاکم و رب کی نہیں بلکہ غلام کی سی ہے اور وہ غلاموں ہی کی طرح شب و روز اللہ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق مصروف عمل ہیں، فرمایا:

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ط (فاطر: ۱۳)

وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں، سورج اور چاند کو اس نے مسخّر کیا ہے، ہر ایک، ایک وقت مقررہ تک کے لیے مصروف گردش ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ ط (الاعراف: ۵۴)

سورج، چاند اور دوسرے ستارے سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔

اتنا ہی نہیں کہ اجرام سماویہ اللہ کے قانون کے تابع ہیں بلکہ قرآن نے یہ اعلان بھی کیا کہ جن مظاہر فطرت کو انسان قابل پرستش سمجھتا رہا ہے، وہ امر الٰہی کے تحت اس کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

آقا اور حامی و ناصر کسی اور کو کیوں بناتے ہو یا اس کی حاکمیت مطلقہ میں کسی مخلوق کو شریک کیوں کرتے ہو؟

کائناتی نظام ربوبیت جو ہر پہلو سے کامل ہے، ہر عقل سلیم رکھنے والے انسان پر اس حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے کہ اس کائنات کا بلا شرکتِ غیرے ناظم و آمر یعنی رب اللہ ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں۔

خادم ہیں، فرمایا :

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝

(ابراھیم : ۳۳)

اور اس نے سورج اور چاند کو تمھارے نفع کے لیے مسخّر کیا جو پیہم رواں دواں ہیں اور تمھارے نفع کے لیے رات اور دن کو مسخّر کیا

اور مظاہر فطرت ہی نہیں بلکہ ساری کائنات انسان کے لیے مسخّر کر دی گئی ہے۔ یہاں کوئی وجود نہیں جس کی پیشانی انسان کی خدمت کے لیے سرنگوں نہ ہو، اس کائناتی حقیقت کا اظہار ایک جگہ ان لفظوں میں کیا گیا ہے :

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (الجاثیہ : ۱۳)

آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں سب کو اس نے تمھارے لیے مسخّر کر دیا ہے۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور کرتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے :

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ (لقمٰن : ۲۰)

کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے ہر چیز کو جو آسمانوں اور زمین میں ہے تمھارے لیے مسخّر کر دیا ہے اور اس نے تم پر اپنی نعمتیں خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی، تمام کر دی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا تصوّر ربوبیت ایک انقلاب آفریں تصوّر ہے۔ اس سے ایک طرف انسانوں کو مظاہر فطرت کی غلامی سے نجات ملی اور پہلی بار کائنات میں اپنے صحیح مقام و مرتبہ کا شعور حاصل ہوا۔ اور دوسری طرف صحیح معنی میں ان پر یہ کائناتی حقیقت منکشف ہوئی کہ اللہ نہ صرف اس عالم ہست و بود کا خالق ہے بلکہ بلاشرکت غیرے اس کا ناظم و آمر یعنی رب بھی ہے۔ اس لیے وہی انسانوں کا حقیقی

معبود و مطاع ہے۔

ماننا ہوگا کہ قرآن مجید کے اس تصوّر ربوبیت نے مظاہر پرستی کے مشرکانہ تصوّر پر کاری ضرب لگائی ہے۔ قرآن مجید کے علاوہ ہم کو کسی دوسری مذہبی کتاب میں ربوبیت کا یہ انقلاب آفریں تصوّر نہیں ملتا۔ مقام عبرت ہے کہ جو قوم اس آفاقی تصوّر ربوبیت کی امین و داعی بنائی گئی تھی وہ آج خود سرتا پا مخلوق پرستی (اولیاء پرستی) میں مصروف ہے۔

قرآن مجید کے تصوّر ربوبیت کا دوسرا پہلو تشریعی ہے۔ افسوس کہ عہد حاضر کے اکثر علماء قرآن مجید کے تشریعی تصوّر ربوبیت سے غافل ہی نہیں اس کے منکر بھی ہیں۔ ہم شروع میں توحید کی اقسام کے ذکر میں اشتراک فی الحکم کے زیر عنوان اس تصوّر پر تفصیلی بحث کر چکے ہیں اسے قارئین دوبارہ ملاحظہ فرمالیں۔ یہاں بغرض استحضار صرف اتنا عرض ہے کہ جس طرح عالم تکوینی میں اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا حاکم و متصرّف نہیں اسی طرح انسانوں کی تمدنی زندگی یعنی عالم تشریعی کا بھی وہ تنہا حاکم علی الاطلاق ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ عالم تکوینی میں اس کی حاکمیت جبری اور بلا شرکت غیرے ہے جبکہ عالم تشریعی میں یہ حاکمیت غیر جبری ہے۔ فی الحقیقت انسان کی تمدنی زندگی کا حاکم علی الاطلاق اور شارع و قانون ساز خود خالق کائنات ہے۔ کسی انسان کو خواہ وہ کسی مقام و مرتبے پر فائز ہو، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خود مختارانہ اس کے بندوں پر اپنا حکم چلائے۔ حکم تو صرف اللہ کے لیے ہے، بندہ صرف اس کی تعلیم و تبلیغ اور تنفیذ پر مامور ہے لیکن عالم تشریعی میں قوانین الٰہی کے ماننے کے لیے انسان کو مجبور نہیں کیا گیا ہے بلکہ بغرض امتحان ایک اجل معیّن تک کے لیے اس کو انکار کی روش اختیار کرنے کی اجازت بھی دی گئی ہے۔ یہی چیز عالم تشریعی میں اللہ کی ربوبیت کو عالم تکوینی کی ربوبیت سے ممتاز کرتی ہے۔

ایک اہم سوال

بعض اہلِ علم کہتے ہیں کہ اگر توحید جیسا کہ قرآن کا بیان ہے، انسانی فطرت کا جزو لاینفک ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہر دور میں انسانوں کی کثیر تعداد شرک میں مبتلا ہوتی رہی ہے حتیٰ کہ مسلمان بھی جو توحید کی آخری علم بردار اُمّت کی حیثیت سے اٹھائے گئے تھے، شرک سے محفوظ نہ رہ سکے حالانکہ قرآن مجید ان کے درمیان کسی لفظی تحریف کے بغیر موجود ہے اور جس کی ہر سورہ توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کے محکم دلائل سے مزیّن ہے۔ اس مسئلے پر غور و فکر کے بعد ہم حسب ذیل نتائج تک پہنچے ہیں۔

توحید سے انسان کے جہل و غفلت کے اسباب

توحید سے انسانوں کی ایک بڑی تعداد کے جہل و غفلت کی پہلی اور سب سے بڑی وجہ اللہ کی بخشی ہوئی عظیم نعمت یعنی عقل سے کام نہ لینا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ انسان دنیا کے ہر معاملہ میں عقل کے استعمال کو ناگزیر جانتا ہے اور اس کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتا ہے لیکن مذہبی اُمور میں وہ اس کے بالکل برعکس مظاہرہ کرتا ہے[1] ان معاملوں میں وہ عقل کو مطلق استعمال نہیں کرتا۔ اگر کچھ لوگ عقل کو استعمال بھی کرتے ہیں تو ٹھیک طور پر نہیں۔ نظامِ عالم پر جس گیرائی و گہرائی کے ساتھ غور و فکر کی ضرورت ہے وہ اس سے پہلو تہی کرتے ہیں اور بھاری پتھر سمجھ کے چوم کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نظامِ ارض و سما میں گہری نظر کے ساتھ

---

[1] اس معاملہ میں مغرب اور مشرق کی کوئی تفریق نہیں۔ دنیا کے ہر ملک کے مذہبی لوگ مذہبی معاملات میں عقل کے استعمال کو شجر ممنوع سمجھتے ہیں حتیٰ کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے اعتبار سے انتہائی ترقی یافتہ قومیں بھی اس معاملے میں غیر ترقی یافتہ قوموں سے ذرا بھی مختلف نہیں ہیں۔

تفکر کے بغیر سررشتۂ توحید کا ہاتھ آنا ممکن نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جہاں توحید کے دلائل انفس و آفاق بیان کیے گئے ہیں وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان میں غور و فکر کرنے والوں اور عقل سے کام لینے والوں کے لیے نشانیاں ہیں یعنی ان کی حقیقت کو وہی لوگ بخوبی سمجھ سکتے ہیں جو عقل کی فطری قوت سے صحیح طور پر کام لیتے ہیں مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے :

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ج لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ○ اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ (البقرۃ: ۱۶۴،۱۶۳)

تمہارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے، اس رحمٰن و رحیم کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، رات و دن کی گردش میں اور ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلا کرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ مردہ زمین کو نئی زندگی دیتا ہے اور ہر قسم کے جانداروں کو اس میں پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں (ان سب میں) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے :

وَهُوَ الَّذِىْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِىَ وَاَنْهٰرًا ط وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ ط اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ وَفِى الْاَرْضِ

قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِى الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ (الرّعد: ۳، ۴)

اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کو نصب کیا اور اس میں دریا جاری کیے اور اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے اور وہی دن پر رات کو طاری کرتا ہے۔ ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اور زمین میں باہم متّصل خطّے پائے جاتے ہیں، انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں، کچھ ایک تنے والے اور کچھ دوہرے تنے والے، سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے مگر ہم مزے میں ایک کو دوسرے پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

ایک اور مقام پر ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ○ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ○ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْىٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ (الرّوم: ۲۲ تا ۲۵)[1]

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمھاری زبانوں اور تمھارے رنگوں کا اختلاف بھی ہے۔ بے شک اس میں علم والوں کے لیے نشانیاں

---

[1] مزید دیکھیں سورہ نحل: ۱۲، ۶، ۷، جاثیہ: ۵

ہیں، اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور تمہارا اس کے فضل (رزق) کو تلاش کرنا ہے۔ اس میں بے شک سننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جس میں خوف اور طمع دونوں ہوتے ہیں۔ اور اوپر سے پانی برساتا ہے جس سے مردہ زمین کو نئی زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں عقل سے کام لینے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔

جو لوگ سرے سے عقل سے کام ہی نہیں لیتے ان کو قرآن مجید نے گونگا، بہرہ اور اندھا قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (البقرہ: ۱۷۱)

اور منکرینِ حق کی مثال اس شخص کی سی ہے جو جانوروں کے پیچھے ان کو ہانکتا پکارتا ہے حالانکہ وہ بجز ہانک اور پکار کے اور کچھ نہیں سنتے، یہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں (انھیں لاکھ سمجھاؤ مگر) کچھ بھی نہیں سمجھتے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ

(الانفال: ۲۲)

بے شک اللہ کے نزدیک بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو گونگے بہرے ہیں کہ عقل سے ذرا بھی کام نہیں لیتے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ (یونس: ۴۲)

ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو (بظاہر) تمہاری بات کان لگا کر سنتے ہیں مگر کیا تم بہرے کو کچھ سنا سکتے ہو خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں۔

مذکورہ آیات قرآنی سے کسی اشتباہ کے بغیر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ توحید سے عام انسانوں کی بے خبری کی ایک بڑی وجہ ان کا عقل سے کام نہ لینا ہے، اور اس کا لازمی نتیجہ شرک ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ شرک میں مبتلا لوگوں کی اکثریت جاہلوں اور کم عقلوں کی ہوتی ہے[۱]

شرک میں مبتلا ہونے کی دوسری بڑی وجہ انسان کا خود اپنی حقیقت سے بے خبر ہونا ہے اور اس کی وجہ بھی غور و فکر کا فقدان ہے۔ انسان اللہ کے سوا جن ہستیوں کی پرستش شروع سے کرتا رہا ہے ان میں فرشتے، گزرے ہوئے

۱۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اگر توحید کی راہ پر صرف اہلِ علم و عقل ہی چل سکتے ہیں تو پھر اس سلسلے میں جہلاء کو کیوں موردِ الزام ٹھہرایا جائے کہ وہ علم سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ توحید کی راہ حقیقی معنوں میں صرف اہل علم ہی پر روشن ہوتی ہے لیکن اہل علم (علماء) کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ کم علموں کو بھی ان کی ذہنی استعداد کے مطابق یہ راہ دکھائیں اور انھیں اس پر چلنے کی ترغیب دیں۔ لیکن اگر خود علماء دیدہ و دانستہ توحید کی راہ چھوڑ دیں اور دنیوی مفادات کی خاطر شرک کے حامی اور اس کے علم بردار بن جائیں تو پھر جہلاء کو راہ ہدایت کون دکھا سکتا ہے۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ آج مقابر و مشاہد سے وابستہ افراد ہی جو عام طور پر تعلیم یافتہ مذہبی گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں، مسلمانوں میں شرک و بدعت کے ذمّہ دار ہیں۔ اس صورتِ حال کا خاتمہ اسلامی ریاست (طاقت) کے بغیر ممکن نہیں ہے کیونکہ دنیا پرست علماء آج توحید کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور جاہل اور نیم خواندہ مسلمانوں کو اپنے دنیوی جاہ و منصب اور مادی عیش و آرام کے لیے گمراہ کرنے پر کمربستہ ہیں۔ ان کی سرکوبی کے بغیر جہلاء کو راہ توحید پر چلانا نہایت مشکل کام ہے۔ لیکن جب تک اسلامی ریاست وجود میں نہ آئے قرآن مجید کی تعلیمات توحید کو ان میں دعوت و تبلیغ کے ذریعہ عام کیا جائے اور دنیا اور آخرت دونوں میں شرک کے ہولناک نتائج سے انھیں ڈرایا جائے۔

صالح بزرگانِ دین اور اجرامِ سماویہ قابل ذکر ہیں[1]۔ انسان کے یہ تینوں مسجود مخلوق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر دور کے مشرکوں نے دیوی دیوتاؤں (اصنام) اور مقابر و مشائخ کی صورت میں ان کی پرستش کی ہے اور آج بھی ان کی عبادت دھوم سے جاری ہے، لیکن انسان ایک لمحہ کے لیے نہیں سوچتا کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر جن کی پرستش کرتا ہے وہ بھی اس کی طرح مخلوق ہیں، ستارے اس کے خادم اور فرشتے خود اس کے آگے سجدہ ریز ہو چکے ہیں: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا (بقرہ: ۳۴) "اور وہ واقعہ بھی ذکر کے قابل ہے کہ جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو وہ سجدے میں گر پڑے"۔ اب جو خود مسجود ملائک اور مخدوم سیارگان ہو وہ ان کا عابد و پرستار بن جائے تو اسے جہل و نادانی نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے۔

انسان کا تیسرا معبود خود انسان ہے۔ کسی وفات یافتہ انسان سے نفع کی اُمید رکھنا، اس کو مشکل کشا اور قاضی الحاجات سمجھ کر پکارنا اور اس کی قبر پر سجدے کرنا یا اس کی مورتی بنا کر پرستش کرنا کم عقلی کا وہ پست ترین مقام ہے جو اللہ نے جانوروں کا رکھا ہے۔ انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے لیکن عقل سے کام نہ لینے کی وجہ سے جانوروں کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔

قرآن مجید نے انسانوں کو بتایا کہ تمھارے گزرے ہوئے ولی اور بزرگ تمھارے ہی طرح انسان تھے، جب وہ باحیات تھے اس وقت بھی بے اختیار تھے اور وفات پانے کے بعد بھی بے اختیار ہیں، وہ کسی پکارنے والے کی پکار کو نہ سنتے ہیں اور نہ اس کی حاجت روائی کی قدرت رکھتے ہیں مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ

---

[1] اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے کسی دور میں بھی اجرام سماویہ اور فرشتوں کی عبادت نہیں کی اور آج بھی اس گندگی سے ان کا دامن ایمان آلودہ نہیں ہے لیکن اولیا پرستی کے مرض سے جس میں عیسائی اور یہودی مبتلا رہے ہیں، محفوظ نہ رہ سکے۔

فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (الاعراف: ۱۹۴)

بے شک تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ تمھاری ہی طرح بندے ہیں، انھیں پکار دیکھو بس ان کو چاہیے کہ وہ تمھارا کہا کر دیں اگر تم اپنے قول میں سچے ہو کہ (وہ حاجت روائی کی قدرت رکھتے ہیں)

شرک کی تیسری وجہ ماحول کی خرابی ہے۔ انسان کے اکثر افکار و اعمال ماحول کا پرتو ہوتے ہیں یعنی جس قسم کا ماحول ہوتا ہے بالعموم اسی طرح کے افکار و خیالات بھی بنتے ہیں۔ اس عمل میں انسان معمول اور ماحول عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر دور میں چند ہی نفوس اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ ہوتے ہیں، عام انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو آدمی جس قوم میں پیدا ہوتا ہے اس کے مذہبی عقائد و اعمال کو بلا سوچے سمجھے اختیار کر لیتا ہے، ہندو کے گھر میں پیدا ہونے والا ہندو، عیسائی کے گھر میں پیدا ہونے والا عیسائی اور مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے والا مسلمان ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی مبنی بر حقیقت بات ارشاد فرمائی ہے:

کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ[۱]

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انسان کی اصل فطرت میں توحید خالص ہے لیکن ماحول کی خرابی اور عقل و فکر کے عدم استعمال کی وجہ سے یہ فطرت غبار آلود ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال ایک آئینہ کی سی ہے جس کی اصل فطرت عکس پذیری اور انعکاس ہے لیکن

---

[۱] بخاری، کتاب الجنائز (باب ما قیل فی اولاد المشرکین) و شرح مسلم، امام نووی ج ۲ ص ۳۳۶ کتب خانہ رشیدیہ دہلی ۱۳۷۶ھ۔ مسلم کے الفاظ یہ ہیں: "کل انسان تلدہ امہ علی الفطرۃ وابواہ بعد یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ"

اگر اس پر مسلسل گرد و غبار اور پانی پڑتا رہے تو وہ اپنی اصل فطرت کھو بیٹھے گا اور اس کی فطری تابناکی ختم ہو جائے گی۔

شرک کی چوتھی وجہ سلطنتِ ارض و سما (ملکوت السمٰوٰت والارض) کو دنیوی حکومتوں پر قیاس کرنا ہے۔ اور یہ بھی کم علمی کے بطن کی پیداوار ہے۔ انسان اس دنیا میں ہمیشہ سے یہی دیکھتا چلا آ رہا ہے کہ بادشاہ عوام کی نظروں سے دور فلک بوس محلوں میں رہتا ہے اور اس کی سلطنت کا سارا نظام اس کے وزرا اور مشیران کار چلاتے ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھتا چلا آیا ہے کہ بادشاہ اپنے کچھ مقرّبان خاص رکھتا ہے، یہ مقرّبانِ عالی مرتبہ بادشاہ سے جس شخص کے لیے انعام و اکرام کی سفارش کرتے ہیں بادشاہ اس کو انعام و اکرام سے نوازتا ہے اور جس کے حق میں سزا کی سفارش کرتے ہیں وہ سزا پاتا ہے اور قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔

دنیوی بادشاہوں کے اس طرز حکومت کو دیکھ کر ہر دور کے انسانوں کی ایک کثیر تعداد نے یہ گمان کر لیا کہ اللہ تعالیٰ بھی سلطنتِ ارض و سما کا انتظام چلانے کے لیے مددگاروں کی ایک جماعت رکھتا ہے۔ اس خیال باطل کے ساتھ انھوں نے وہ تمام امور بھی فرض کر لیے جو دنیوی بادشاہوں کا طرۂ امتیاز ہیں حتّٰی کہ بہت سے نادانوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ اللہ بیوی اور بچّے رکھتا ہے۔ کھلی بات ہے کہ ربّ قدوس کا طرز حکومت اور کاروبار جہانبانی انسان کے طرز حکمرانی سے قطعاً مختلف ہے اور اسے مختلف ہونا بھی چاہیے کہ وہ ہر عیب و نقص سے منزّہ ذات ہے، ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا۠

(بنی اسرائیل: ۱۱۱)

کہہ دو کہ ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس کی کوئی اولاد نہیں اور نہ اس کی سلطنت میں کوئی شریک ہے اور نہ کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار ہے اور اس کی خوب بڑائی بیان کرو۔

توحید کے عقلی دلائل

یہ بات کہ اللہ ہی اس کائناتِ بے کراں کا ناظم و حاکم اور آمر و متصرّف ہے ایک بالکل بدیہی حقیقت ہے، لیکن بہت سارے انسان جیسا کہ اوپر بیان ہوا علم کی کمی اور بے عقلی کی وجہ سے اس حقیقت کے ادراک سے قاصر رہتے ہیں اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ توحید الٰہ کے اثبات میں یہاں وہ عقلی دلائل بیان کر دیے جائیں جو خود قرآن مجید نے اس باب میں پیش کیے ہیں۔

توحید الٰہ کی سب سے بڑی قرآنی دلیل یہ ہے کہ اگر سلطنتِ ارض و سما میں ایک سے زیادہ مراکز اقتدار موجود ہوتے یعنی کوئی ہوا پر، کوئی پانی پر، کوئی سمندر پر کوئی زمین کے خزانوں پر اور کوئی گردشِ شمس و قمر پر حاکم و متصرّف ہوتا تو پھر ناگزیر تھا کہ یہ مختلف اقتدارات باہم ٹکرا جائیں کیونکہ اقتدار کا یہ فطری خاصہ ہے کہ وہ دوسرے اقتدار کو برداشت نہیں کرتا ہے۔ اقتدارات کے اس تصادم سے نظامِ کائنات کا درہم برہم ہو جانا یقینی تھا جیسا کہ دنیوی حکومتوں میں مختلف اقتدارات کی آویزش سے نظمِ حکومت زیروزبر ہو جاتا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کا نظام حیرت انگیز طور پر نظم و ضبط اور باہم توافق و سازگاری کا مظاہرہ کرتا ہے، کائنات کے کسی گوشے میں کبھی ادنیٰ انتشار و اختلال نظر نہیں آتا۔ اس بادشاہ حقیقی کی سلطنت میں جو وجود بھی ہے وہ اس کا تابع فرمان ہے اور اپنے مقررہ فرائض کو کامل اطاعت کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔ آج تک اس کے کسی گوشے میں حکم عدولی کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سورج، چاند اور ستاروں نے اپنی گردش بند کر دی ہو یا ان کی گردش کا جو راستہ، طریقہ اور رفتار متعیّن ہے اس میں انھوں نے کوئی معمولی سی کمی و بیشی کر دی ہو، ہواؤں نے چلنا چھوڑ دیا ہو، یا دلوں نے مقررہ وقت و موسم میں برسنے سے انکار کر دیا ہو، زمین نے غلّہ اُگانے کی ذمّہ داری چھوڑ دی ہو یا اُس کے آغوش میں تخم تو گیہوں کا ڈالا گیا ہو لیکن اس نے پودا جو کا اُگا دیا ہو

وغیرہ، کائنات کا ہر واقعہ نہایت منظم طریقے سے وقوع میں آتا ہے اور یہی بے مثال نظم وضبط اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس کائنات میں بہت سے مراکز اقتدار کے بجائے ایک ہی مرکز اقتدار ہے جس کے ماتحت کائنات کی ہر شے حد درجہ نظم وضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے مصروف عمل ہے۔

توحید الٰہ کی دوسری عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر بغرض محال کائنات میں ایک سے زیادہ مراکز اقتدار یعنی الٰہ موجود ہوں تو پھر تسلیم کرنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تنہا نظام کائنات چلانے کی قدرت نہیں رکھتا دوسرے لفظوں میں وہ عاجز و ناتواں ہے۔ اس عجز و ناطاقتی کے ساتھ ہمارا یہ قول کہ اللہ اس ہستی کا نام ہے جو سب سے بڑی اور سب سے طاقت ور ہے ایک بے معنی قول ہو جاتا ہے۔ اس عظمت و برتری کے ساتھ عجز و ناتوانی کا اجتماع کیونکر ممکن ہے۔ کیا فی الواقع کوئی ہوشمند انسان ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیوی بادشاہوں اور حکمرانوں کی طرح اپنی سلطنت کا نظام کسی کی مدد کے بغیر چلانے سے قاصر ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ شرکتِ اقتدار کمزوری کی علامت ہے اور اللہ کی ذات اس نقص سے بالکل پاک ہے: وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ (بنی اسرائیل: ۱۱۱)

توحید الٰہ کے جو قرآنی دلائل ہم نے اوپر بیان کیے ہیں انھیں خود قرآن مجید کی زبان اور اسلوب میں ملاحظہ فرمائیں، ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ (الانبیاء: ۲۲)

اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا اور بھی الٰہ (مقتدر اعلیٰ) ہوتے تو نظامِ ارض وسما درہم برہم ہو جاتا، پس اللہ جو عرش (تخت سلطنت) کا مالک ہے ان تمام (مشرکانہ) باتوں سے پاک ہے جو یہ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے:

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ

اِلٰـهٍ، بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ط (المؤمنون: ۹۱)

اللہ نے نہ کوئی بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر الٰہ اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور ہر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتا۔

ایک اور جگہ ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ○ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ○

(بنی اسرائیل: ۴۲، ۴۳)

اے نبی (ان سے) کہو کہ اگر اللہ کے ساتھ اور الٰہ بھی ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو انھوں نے عرش والے تک (پہنچنے) کا راستہ ضرور ڈھونڈ لیا ہوتا یعنی ان میں مقابلہ آرائی ہوتی) یہ لوگ جو کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور بہت زیادہ بلند و برتر ہے۔

زینوفن، یونان کا ایک موحد فلسفی گزرا ہے اس نے توحید الٰہ کے اثبات میں جو دلائل دیے ہیں وہ حیرت انگیز طور پر قرآن کے مذکورہ دلائل سے مطابقت رکھتے ہیں، لکھتا ہے:[1]

"ہر اعتبار سے کامل اور مقتدر ہستی صرف ایک ہی ہو سکتی ہے کیونکہ ایک سے زیادہ کی صورت میں ہر ایک پر کاملیت اور اقتدار کا اطلاق یکساں طور پر نہیں ہو سکتا ہے۔"

اس فلسفی نے توحید الٰہ کی دوسری دلیل یہ دی ہے کہ جس طرح دو کامل مقتدر (Omni potent) نہیں ہو سکتے اسی طرح دو ازلی الٰہ بھی نہیں ہو سکتے ہیں اس لیے ماننا ہو گا کہ کائنات میں صرف ایک اللہ ہے جو جسمانیت سے پاک ہے۔

---

[1] ولیم ڈریپر، ہسٹری آف دی انٹلکچول ڈیولپمنٹ آف یورپ ج ۱ ص ۱۱۴۔

کوئی شکل وصورت نہیں رکھتا اور نہ کسی پہلو سے آدمی سے مشابہت رکھتا ہے حتیٰ کہ اس کے خیالات بھی آدمیوں کے خیالات جیسے نہیں ہیں۔

اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اللہ کا اقتدار ناقابلِ تقسیم ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ بعض حصۂ کائنات پر وہ حکومت کرے اور بعض پر دوسرے کیونکہ اس صورت میں اس کا اقتدار کامل نہیں کہا جا سکتا ہے۔ وہ سرتاپا تعقّل (Reason) شعور (Intelligence) اور اقتدار (omni Potence) ہے۔ وہ دنیا پر کسی ادنیٰ مشکل کے بغیر عقل وبصیرت (Reason and Light) سے حکومت کرتا ہے۔[۱]

توحید کے تقاضے

توحید کے بعض تقاضے تو وہ ہیں جن کا تعلق عالم تکوینی سے اور بعض کا تعلق عالم تشریعی سے ہے لیکن ان دونوں تقاضوں میں تھوڑا فرق ہے اس لیے پہلے ہم عالم تکوینی کے تقاضے بیان کریں گے اور اس کے بعد عالم تشریعی کے تقاضوں پر روشنی ڈالیں گے۔ ان تقاضوں کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

تکوینی تقاضے

(۱) اللہ ہی تنہا طاقت وقوت کا مالک ہے:

توحید کا پہلا تکوینی تقاضا یہ ہے کہ کائنات خلقت میں ایک ہی مرکز اقتدار کو تسلیم کیا جائے اور وہ مرکز اقتدار اللہ ربّ العزت کی ذات ہے۔ کسی مخلوق کے بارے میں خواہ وہ فرشتے ہوں، ستارے ہوں اور خواہ وفات یافتہ انسان ہوں، یہ گمان رکھنا کہ وہ بالذّات صاحب قدرت ہیں توحید کے منافی ہے۔

---

[۱] ہسٹری آف دی انٹلکچول ڈیویلپمنٹ آف یورپ، ج ۱ ص ۱۱۵

یہ حقیقت اگر دنیا کی زندگی میں انسانوں کے جہل و غفلت کی وجہ سے مخفی ہے تو روزِ آخرت بالکل کھل کر سامنے آجائے گی اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ وہ دنیا میں جن ہستیوں (بزرگان دین) کو صاحب اختیار سمجھ کر پکارتے تھے وہ بالکل بے اختیار تھیں۔ ان کے یہ معبود بھی ان سے اظہار لاتعلقی کر دیں گے، صاف کہہ دیں گے کہ تم مشرک تھے تم سے ہمارا کوئی رشتہ ناطہ نہیں، ہم نے کب کہا تھا کہ ہم کسی طرح کا اقتدار و اختیار رکھتے ہیں، یہ محض تمہارا افتراء ہے، طاقت و قوت کا مالک اللہ کے سوا اور کوئی نہیں: اِنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ط (البقرہ: ۱۶۵)

(۲) اللہ بلا شرکت غیرے اس کائنات کا ناظم و آمر ہے

صرف اتنا ہی نہیں کہ اس کائنات کا اقتدار و اختیار ایک اللہ کے ہاتھ میں ہے بلکہ وہ تنہا اس پر حکومت بھی کرتا ہے دوسرے لفظوں میں وہی تنہا اس کا ناظم و آمر ہے۔ اس نظم و انتظام کائنات میں اس کا کوئی معین و مددگار نہیں ہے اور نہ اس نے اپنی مرضی و خوشی سے از راہ اعزاز و اکرام کسی مخلوق کو کار جہانبانی میں شریک کیا ہے، خلق و امر دونوں کا سررشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ ط اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (الاعراف: ۵۴)

بے شک تمہارا رب (حاکم و آمر) اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن (دور) میں پیدا کیا پھر عرش پر متمکن ہوا، رات سے دن کو ڈھانکتا ہے اس طور پر کہ شب اس دن کو سرعت کے ساتھ آلیتی ہے اور سورج، چاند اور ستارے سب اس کے تابع فرمان ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے خلق بھی اور امر بھی، بڑا بابرکت ہے وہ اللہ جو سارے جہانوں کا پروردگار، آقا اور حاکم ہے۔

(٣) اللہ ہی کارساز اور مشکل کشا ہے

جب اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری ہستی کسی نوع کا اقتدار واختیار نہیں رکھتی ہے تو لازماً وہی انسانوں کا حاجت روا اور مشکل کشا بھی ہوگا اور اسی کو حاجات وبلایا میں مدد کے لیے پکارنا چاہیے۔ جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کو مدد کے لیے پکارتا ہے وہ گویا اسے صاحب اقتدار و اختیار سمجھتا ہے اور یہ حقیقت واقعہ کے خلاف ہے۔

قرآن مجید میں ایک لفظ ولی استعمال ہوا ہے اور بکثرت مقامات پر فرمایا گیا ہے کہ اللہ ہی انسانوں کا ولی یعنی کارساز ہے[1]۔ اس واضح اعلان کے باوجود جو لوگ اللہ کے بندوں کو ولی یعنی کارساز قرار دیتے ہیں وہ یقیناً کفر کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند آیات ملاحظہ فرمائیں:

(١) وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ (البقرہ: ١٠٧)

اللہ کے سوا نہ تمہارا کوئی کارساز ہے اور نہ مددگار۔

(٢) قُلْ اَغَيْرَ اللهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ط (الانعام: ١٤)

کہہ دو کہ کیا میں اس اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا کارساز و حامی بنالوں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، وہ سب کو کھلاتا ہے اس کو کوئی نہیں کھلاتا (یعنی وہ سب کا حاجت روا ہے لیکن خود ہر حاجت سے مبرّا ہے)۔

---

[1] ولی کے معنی دوست کے بھی ہیں اور مومنین صالحین کے لیے ایک جگہ یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ (یونس: ٦٢) "سن لو کہ اللہ سے محبت کرنے والوں کے لیے کوئی خوف کی بات نہیں۔" لیکن دوسرے مقامات پر یہ کارساز ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ آیاتِ محوّلہ بالا سے واضح ہے۔

(۳) اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَاۗءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ۝ (الکہف : ۱۰۲)

پس کیا ان کافروں (منکرین حق) نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ مجھ کو چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز بنالیں (اور میں ان سے محاسبہ نہ کروں گا) ہم نے ایسے کافروں کے لیے جہنم کو ان کے لیے بطور استقبال تیار کر رکھا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَاۗءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ښ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (العنکبوت : ۴۱)

جن لوگوں نے اللہ کے سوا اور کارساز و حاجت روا بنا رکھے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا اور بلاشبہ سب گھروں میں زیادہ بودا گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے، کاش وہ (اصل حقیقت کو) جانتے۔

(۵) قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۝ (الرعد : ۱۶)

کہو، کیا تم لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اوروں کو کارساز بنالیا ہے جو اپنے نفع ونقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔

یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ قرآن مجید کی ان واضح تعلیمات کے باوجود آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بزرگانِ دین کو مشکل کشا اور فریادرس سمجھتا ہے۔ اس معاملے میں ہندی مسلمانوں کی ذہنی حالت کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:[۱]

---

[۱] یہ ایران اور عراق جنگ کی ایک رپورٹ سے ماخوذ ہے۔ ملاحظہ ہو: ہفت روزہ نئی دنیا دہلی۔ جلد ۱۷ شمارہ ۸ ص ۱۴ (۲۹ جولائی تا ۴ اگست ۱۹۸۸ء)

"بغداد پہنچتے ہی سب سے پہلے غوث[1] پاک شیخ عبدالقادر جیلانی کے مزار اقدس پر حاضری دینے گیا میرے ساتھ دو ہندوستانی غیر مسلم صحافی اور ایک پاکستانی صحافی بھی تھے، یہ تینوں مجبوراً میرے زور دینے پر غوث پاک کے مزار پر گئے تھے اور ان کا خیال تھا کہ میں وقت برباد کر رہا ہوں لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ اگلے دن غوث پاک کے مزار پر دی جانے والی حاضری ان کی زندگی کی ضمانت بن جائے گی۔"

آگے ایک حادثے کا ذکر ہے جس میں صحافیوں کی گاڑی پر غلطی سے ایک عراقی ٹینک گذر گیا تھا جس کے نتیجے میں ایک ترک صحافی ہلاک اور چند دوسرے صحافی شدید طور پر زخمی ہوگئے تھے لیکن جن صحافیوں نے شیخ عبدالقادر جیلانی کے مزار پر حاضری دی تھی ان کو خراش تک نہیں آئی۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ہندی مسلم صحافی لکھتا ہے:

"ہندوستانی صحافیوں کو ذرا سی بھی خراش نہیں آئی، ہمارے ہندوستانی صحافیوں کو یقین ہوگیا کہ یہ غوث پاک شیخ عبدالقادر جیلانی کے مزار پر حاضری کا نتیجہ تھا کہ ہم لوگ محفوظ رہے۔ اس کے بعد جتنے دن ہم بغداد میں رہے روز غوث پاک کے مزار پر حاضری دیتے تھے۔"

فاعتبروا یا اولی الابصار

توکّل علی اللہ

توحید کا ایک اہم تقاضا توکّل بھی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ توحید کی

---

[1] اللہ کے علاوہ کسی ولی یا پیر کو غوث کا نام دینا صحیح نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: انہ لا یستغاث بی وانما یستغاث باللہ۔ (طبرانی)

روح ہے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ توکل[1] کے مفہوم میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ اکثر صوفیہ کے نزدیک توکّل ترک تدابیر اور نفی اسباب کا نام ہے۔ لیکن غیر صوفی علماء کے نزدیک توکّل اور تدبیر میں کوئی تخالف نہیں ہے بلکہ از روئے قرآن وسنت تدبیر کا اختیار کرنا ہر بندۂ مومن کے لیے ضروری ہے البتہ نتیجۂ تدبیر کے بارے میں اللہ کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ آیئے دیکھیں کہ اس سلسلے میں قرآن مجید ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے۔

قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ رب العزّت کی ذات پر اعتماد و توکّل جزو ایمان ہے اس کے بغیر نہ ایمان معتبر اور نہ ہی اسلام کے کوئی معنی ہیں جیسا کہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا[2] ○

(المزمّل: ۹)

وہ مشرق اور مغرب دونوں کا رب ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں پس اسی کو کفایت کرنے والا بنالو (یعنی اپنے معاملے کو اسی کے سپرد کردو اور اس پر بھروسہ کرو)

دوسری جگہ ہے:

قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابُ ○

(الرعد: ۳۰)

کہہ دو کہ وہ میرا رب ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کے پاس مجھے جانا ہے۔

---

[1] توکّل کی اصل وکل ہے، کہا جاتا ہے وکلت امری الی فلان ای الجأته الیه واعتمدت فیه علیه یعنی میں نے اپنے معاملے کو اس کے سپرد کر دیا اور اس پر بھروسہ کیا۔ (ابن حجر عسقلانی، فتح الباری ج ۱۱ ص ۳۰۶)

[2] وکیل وہ ہے جس پر بھروسہ کیا جائے، جس کو عاجز آدمی اپنا کام سپرد کر دے (منجد)

ایک اور جگہ ہے :

وَقَالَ مُوسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ[1] (یونس : ۸۴)

موسیٰ نے کہا، اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے مطیع و فرماں بردار ہو تو اسی پر بھروسہ کرو۔

توکّل کا غیر قرآنی تصوّر

آیات مذکورہ میں جس توکّل کی تعلیم دی گئی ہے اس کا مطلب صوفیہ کے نزدیک جیساکہ ہم نے شروع میں کہا، ترک تدابیر اور نفی اسباب ہے کیونکہ ان کے نزدیک تدابیر و اسباب کے اختیا کرنے کے معنی سبب حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت سے چشم پوشی کے ہیں اور یہ خلاف توکّل ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ سے کچھ لوگوں نے پوچھا کہ رزق کہاں تلاش کیا جائے تو انھوں نے جواب دیا "اگر تمھیں یہ جگہ معلوم ہے تو وہاں اسے تلاش کرو" لوگوں نے پوچھا کہ اللہ سے سوال کریں؟ انھوں نے کہا "اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس نے تمھیں فراموش کر دیا ہے تو پھر اس کو ضرور یاد دلاؤ" انھوں نے پھر پوچھا کہ کیا ہم توکّل کے خیال سے اپنے گھروں میں بیٹھ جائیں؟ انھوں نے جواب دیا "تجربہ کرنا شک کے مرادف ہے" آخر میں پوچھا گیا کہ پھر کیا تدبیر اختیار کی جائے؟ انھوں نے کہا "ترک تدبیر"[2]

یہی خیال امام غزالی کا بھی تھا، فرماتے ہیں[3]:

---

[1] اس آیت سے بالکل واضح ہے کہ ایمان اور اسلام کا لازمی تقاضا توکّل ہے۔ جو شخص اللہ کی ذات پر بھروسہ نہیں رکھتا اس کا دعویٰ ایمان و اسلام بے معنی ہے۔

[2] امام ابوالقاسم قشیری "الرسالۃ القشیریۃ"، مصر ۱۳۰۴ھ ص ۱۰۱

[3] المرشد الامین، خلاصہ احیاء العلوم، امام غزالی، نئی دہلی ۱۹۸۸ء ص ۲۴۸، ۲۴۹

"توکّل کے تین درجے ہیں، پہلا درجہ یہ کہ اللہ پر وثوق ہو جیسا کہ امانت دار، مہربان، شفیق، درست کار وکیل پر ہوتا ہے، دوسرا یہ کہ اللہ کے ساتھ ایسا معاملہ ہو جیسے بچّے کا ماں کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ اس کے سوا کسی کو نہیں جانتا اور اسی کی طرف ہر بات میں رجوع کرتا ہے اور سب سے پہلے اسی کا خیال اس کے دل میں آتا ہے، یہ مقام ترکِ دعا اور سوال غیر اللہ کو چاہتا ہے کیونکہ وہ شفیق وکریم ہے۔ اب آپ سوال کریں گے کہ کیا بندے کا اسباب و تدابیر کے ساتھ کوئی تعلق رہ جاتا ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ تیسرا مقام تدبیر کی نفی کرنا ہے البتہ اللہ سے دعا اور بچّے کی طرح تضرّع وزاری کرسکتا ہے۔"

امام موصوف نے اپنی کتاب منہاج العابدین میں صاف طور پر لکھا ہے کہ انسانی رزق مقدّر و مؤقّت ہے اس لیے رزق اور اسباب رزق کی جستجو تحصیل لاحاصل ہے، فرماتے ہیں:[1]

فتبين لك أن طلب الرزق واسبابه ليس بامر لازم للعبد (فان قلت) هل يزيد الرزق بالطلب وهل ينقص بترك الطلب. فاعلم أنه مكتوب في اللوح المحفوظ مقدر ومؤقت ولا تبديل لحكم الله ولا تغير لقسمته وكتابته.

"تم پر یہ بات واضح ہو چکی کہ رزق اور اسباب رزق کی تلاش بندے کے لیے ضروری نہیں ہے (اگر تم کہو) کیا تلاش وجستجو سے رزق میں اضافہ اور اس کے ترک سے کمی واقع ہوتی ہے؟ تو جان لو کہ رزق لوح محفوظ میں لکھا جا چکا ہے۔ وہ مقدّر اور مؤقّت ہے اور اللہ کا فیصلہ ناقابل تبدیل ہے

---

[1] امام غزالی، منہاج العابدین، ص ۵۵

اور اس کی تقسیم اور اس کے لکھے میں کوئی ترمیم و تغیر ممکن نہیں ہے۔

ایک ہندی صوفی حکیم شیخ صدرالدین دہلویؒ[1] نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں ان کا ایک خط درج کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں[2]:

"یقین کر لو کہ زندگی و رزق مقرر ہے۔ جو دوڑ دھوپ کرنے سے کم و بیش نہیں ہوتا۔ جب کہ رزق کسی شرط پر نہیں دیا جاتا تو بہتر ہے کہ عمر کو طلب حق میں مشغول رکھا جائے اور سلوک کی آخری منزل طے کی جائے۔ سب جاندار اللہ کے بندے ہیں جن کو رزق دینا اللہ کا کام ہے جیسا کہ اللہ نے خود فرمایا ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ...... اے برادر جواں ہمّت جو کوئی اس کا یقین نہ کرے وہ مومن نہیں کافر ہے۔"

ذوالنون مصری کے نزدیک ترک تدبیر ہی حقیقی توکل تھا۔ اپنے بحری سفر کا ایک واقعہ انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے[3]:

سافرت سنین وما صح لی التوکل الا وقتاً واحداً۔ رکبت البحر فکسر المرکب فتعلت بخشبة من خشب المرکب فقالت لی نفسی ان حکم الله علیك بالغرق فما تنفعك هذه الخشبة فخلیت الخشبة فطفت علی الماء فوقعت علی الساحل۔

میں نے برسوں سفر کیا لیکن حقیقی توکل تک صرف ایک بار پہنچ سکا۔ ایک بحری

---

[1] نصیرالدین چراغ دہلوی کے جلیل القدر خلیفہ تھے۔

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، اردو ترجمہ مولانا اقبال الدین احمد ص ۲۶۳

[3] ابن الجوزی، تلبیس ابلیس ص ۲۷۸

کے دوران میرا جہاز شکستہ ہوگیا۔ حفاظت کے خیال سے میں شکستہ جہاز کے ایک تختہ پر سوار ہوگیا۔ لیکن میرے دل نے کہا کہ اگر اللہ نے تیرے حق میں ڈوب جانے ہی کا فیصلہ کر دیا ہے تو لکڑی کا یہ تختہ تیرے کس کام آسکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اسے چھوڑ دیا اور پانی پر آرہا اور بالآخر ساحل تک پہنچ گیا۔"

توکّل سے متعلق ایک دوسرا واقعہ بھی قابل ملاحظہ ہے۔ روایت ہے کہ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر جب جنگلوں اور پہاڑوں میں ریاضت کر رہے تھے تو ایک دن ان کو بہت پیاس معلوم ہوئی۔ ایک کنویں کے پاس پہنچے لیکن وہاں کوئی ڈول ڈوری نہ تھی ناامید ہوکر کنویں کے پاس کھڑے ہوگئے۔ تھوڑی دیر میں دو جنگلی ہرن کنویں کے پاس آئے۔ کنویں کا پانی اُبل کر کنارے تک آگیا دونوں ہرنوں نے اپنی پیاس بجھائی۔ شیخ فریدین بھی پانی پینا چاہتے تھے کہ پانی گہرائی میں اُتر گیا۔ شیخ نے متحیّر ہوکر آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر کہا "الٰہی ہرنوں کو تو تونے پانی پلایا اور اپنے بندے کو محروم کر دیا۔" آواز آئی کہ تونے ڈول ڈوری پر اعتماد کیا اور ان جانوروں نے مجھ پر بھروسہ کیا اس لیے تم محروم رہے اور یہ دونوں سیراب ہوئے۔"[1]

نفی اسباب کے لیے یہ واقعہ جس طور پر گھڑا گیا ہے وہ محتاج تشریح نہیں۔ تلاش رزق کی طرح علاج و معالجہ بھی صوفیہ کے نزدیک خلاف توکّل ہے۔ روایت ہے کہ ابو درداء سے ان کی بیماری کے ایام میں پوچھا گیا کہ آپ کو کیا شکایت ہے (ماتشتکی) کہا: میرے گناہ (ذنوبی) عرض کیا گیا کہ آپ کی خواہش کیا ہے (ماتشتھی) فرمایا: اپنے رب کی رحمت چاہتا ہوں۔ کہا گیا کہ آپ کے علاج کے لیے کوئی طبیب بلایا جائے، ارشاد ہوا: طبیب ہی نے تو مجھے بیمار کیا ہے (الطبیب امرضنی)[2]

---

[1] خزینۃ الاصفیاء، ج ۱ ص ۲۹۳ بحوالہ بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن ص ۱۲۱

[2] الدکتور سلمان قطایۃ، مخطوطات الطب والصیدلۃ فی المکتبات بحلب، طبع اول ۱۳۹۷/۱۹۷۶۔ ص ۲۰۵

بیان کیا جاتا ہے کہ صلحاء کی ایک جماعت عیادت کی غرض سے ایک شیخ کے پاس گئی ان میں سے کسی نے کہا: آپ کے لیے کوئی طبیب بلادیں؟ وہ خاموش رہے اور پھر فرمایا:[1]

ان الطبیب بطبه ودوائه — لا یستطیع دفع امر قدرا

هلك المداوی والمداوٰی والذی — جلب الدوا وباعه ومن اشترٰی

"بے شک طبیب اپنی طبی حذاقت اور عمدہ دواؤں کے باوجود امرِ مقدر یعنی موت کو دفع نہیں کرسکتا ہے۔ علاج کرنے والے اور علاج کرانے والے اور اس کے بائع وخریدار سب ہلاک ہوگئے۔"

توکّل کا مذکورہ تصوّر یعنی تلاش رزق اور علاج ومعالجہ کی نفی، تمام ترغیر قرآنی تصوّر ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس تصوّر توکل کی غلطی کو قرآن اور سنّت کے شواہد کی روشنی میں بالکل واضح کر دیا جائے تاکہ آگے چل کر قرآن مجید کے تصوّر توکل کو کسی دشواری کے بغیر سمجھا جاسکے۔

صوفیہ نے اپنے تصوّر توکل کے حق میں جن آیات قرآنی سے استشہاد کیا ہے ان میں سے دو آیتیں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، ایک آیت ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (هود: ٦) "کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمّہ نہ ہو۔" اور دوسری آیت ہے: وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ (عنكبوت: ٦٠) "اور بہت سے جاندار ایسے ہیں جو اپنی غذا اٹھا کر نہیں چلتے۔ اللہ ہی ان کو بھی روزی دیتا ہے اور تم کو بھی۔"

ان آیات کی بنیاد پر صوفیہ جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے، کہتے ہیں کہ تلاش رزق اور اس کے لیے اسباب کی جستجو بندے کا کام نہیں کیونکہ اللہ نے کسی ذریعہ کی قید لگائے بغیر اپنی مخلوقات کو رزق پہنچانے کی مطلق ضمانت لے رکھی ہے۔[2]

صوفیہ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ مذکورہ آیات میں صرف یہ بتایا گیا

---

[1] مخطوطات الطب والصیدلہ ص۲۰۶

[2] منہاج العابدین، ص۴۳

ہے کہ ہر ذی حیات کا رزق اللہ کے ذمہ ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ بغیر سعی و جہد کے ہر جاندار کا رزق اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ یہ ایک مشاہداتی حقیقت ہے کہ تمام حشرات الارض اور چرند و پرند اپنے اپنے رزق کی تلاش میں سرگرمی دکھاتے ہیں اور اللہ کے وعدہ کے مطابق اپنا رزق پاتے ہیں۔ آج تک یہ واقعہ کہیں رونما نہیں ہوا کہ کسی چڑیا کا رزق اس کے گھونسلے میں، کسی جانور کا رزق اس کے تھان پر اور کسی کیڑے مکوڑے کا رزق اس کے بل میں ان کی محنت و مشقت کے بغیر پہنچ گیا ہو۔ جب انسان سے کم تر درجہ کی مخلوقات اپنے رزق کے حصول میں جد و جہد کرتی ہیں اور بغیر جد و جہد کے ان کو ایک دانہ بھی نہیں ملتا تو انسان جو اشرف المخلوقات ہے اسے کسی سعی و تدبیر کے بغیر رزق کیوں مل جائے گا۔ وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اپنے پوشیدہ رزق کو تلاش کرے کیونکہ اسے اللہ نے جسم کے ساتھ عقل کا چراغ بھی عطا کیا ہے۔ قرآن مجید نے سعی و جہد کی حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم: ۳۹)

اور یہ کہ انسان کے لیے بس وہی کچھ ہے جس کی وہ جد و جہد کرتا ہے۔

قرآن مجید کے اس واضح اعلان کے بعد بھی یہ کہنا کہ تلاش رزق بندے کا کام نہیں قرآن مجید سے کس قدر بے اعتنائی کی دلیل ہے۔ یہ آیت بھی ملاحظہ فرمائیں:

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (الجمعة: ۱۰)

جب صلاۃ ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو۔

اس آیت میں تلاش رزق کو فضل ربانی کی تلاش سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء کا عمل کسب معاش کی فضیلت پر ایک بڑی دلیل ہے۔ کسی نبی یا رسول نے یہ نہیں کہا کہ

تلاش رزق توکل کے خلاف ہے۔ اس سلسلے میں علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں:[1]

ھذا کلام قوم[2] ما فھموا معنی التوکل وظنّوا انه ترک الکسب وتعطیل الجوارح عن العمل وقد بیّنا ان التوکل فعل القلب فلاینافی حرکۃ الجوارح ولوکان کل کاسب لیس بمتوکل لکان الانبیاء غیر متوکلین فقد کان آدم حراثا ونوحا وزکریا نجارین وادریس خیاطا وابراھیم ولوط زراعین وصالح تاجرا وکان سلیمٰن بعمل الخوص وداود یصنع الدرع ویاکل من ثمنه وکان موسٰی وشعیب ومحمد رعاۃ صلوٰت اللہ علیھم اجمعین۔

یہ ان لوگوں کا قول ہے جو توکل کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے اور یہی خیال کیا کہ ترک کسب اور جوارح سے کام نہ لینا ہی توکل ہے۔ ہم اس سے پہلے واضح کر چکے ہیں کہ توکل کا تعلق قلب سے ہے اس سے عمل (حرکت جوارح) کی نفی نہیں ہوتی۔ اگر تمام کمانے والے توکل سے محروم ہیں تو پھر ماننا ہوگا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ بھی غیر متوکل تھے۔ معلوم ہے کہ آدم کاشت کار تھے، نوح وزکریا بڑھئی تھے، ادریس درزی تھے، ابراہیم اور لوط بھی کاشت کار تھے، صالح تاجر تھے، سلیمان چٹائی بننے کا کام کرتے تھے، داؤد زرہ بناتے تھے اور اسی کی آمدنی پر ان کا گذر بسر تھا، اور موسیٰ وشعیب اور محمد علیہم الصلوٰۃ مویشیوں کو چراتے تھے۔"

رزق کے معاملے میں توکل یہ نہیں ہے کہ آدمی حصول رزق کے لیے سعی وتدبیر نہ کرے بلکہ حقیقی توکل یہ ہے کہ وہ کل کی فکر چھوڑ دے یعنی یہ نہ سوچے کہ کل کہاں سے رزق ملے گا۔[3] جس اللہ نے سعی وتدبیر کے نتیجے میں آج رزق دیا ہے وہ کل بھی دے گا۔ انسان

---

[1] ابن الجوزی، تلبیس ابلیس ص ۲۸۱

[2] ابن الجوزی نے یوسف بن حسین کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کمانے والے مرید کو پسند نہیں کرتے تھے (تلبیس ابلیس ص ۲۸۱)

[3] حضرت انس کا بیان ہے کہ: ان رسول اللہ کان لا یدّخر لغد " رسول اللہ کل کے لیے کوئی چیز اٹھا کر نہیں رکھتے تھے (علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی ج ۲ ص ۲۷۶)

کا کام صرف سعی و تدبیر کرنا ہے رزق پہنچانے کا ذمہ اللہ نے خود لے رکھا ہے۔ سعی سے غفلت کرنے والوں کو اس کے خزانۂ رزق سے ایک دانہ بھی نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں ایک روایت ملاحظہ ہو[۱]:

عمر بن الخطاب یقول: انه سمع نبی الله صلی الله علیه وسلم یقول: لو انکم تتوکلون علی الله حق توکله لرزقکم کما یرزق الطیر تغدوا خماصًا و تروح بطانًا۔

حضرت عمر فرماتے ہیں کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: اگر تم لوگ حقیقی معنی میں اللہ پر بھروسہ کرتے تو وہ تم کو اسی طرح رزق دیتا جس طرح وہ پرندوں کو دیتا ہے جو صبح کو خالی پیٹ اپنے آشیانوں سے نکلتے ہیں اور شام کو شکم سیر ہو کر واپس آتے ہیں۔

روایت میں " تغدوا خماصًا وتروح بطانًا " کا جملہ صراحت کر رہا ہے کہ چڑیوں کو اللہ تعالیٰ اس وقت رزق مہیّا کرتا ہے جب وہ "سعی" کے قانون الٰہی پر عمل کرتی ہیں یعنی صبح کو خالی پیٹ رزق کی تلاش میں اپنے گھونسلوں کو خیرباد کہہ دیتی ہیں۔[۲]

امام احمد بن حنبل نے اس روایت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ ایک بار ان سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اپنے گھر یا مسجد میں بیٹھ رہے اور کہے کہ میں کوئی کام نہیں کروں گا یہاں تک کہ میرا رزق مجھے مل کر رہے گا۔ فرمایا: ایسا آدمی حقیقت سے بالکل بے خبر ہے اور پھر مذکورہ حدیث پڑھی اور کہا کہ چڑیاں رزق کی تلاش میں

۱۔ مسند امام احمد بن حنبل ص ۲۰۶ (حدیث نمبر ۲۰۵)

۲۔ عجیب بات ہے کہ بہت سے صوفیہ نے اس روایت کو اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں پیش کیا ہے کہ جو اللہ چڑیوں کو کھلاتا ہے وہ انسان کو کیوں نہ کھلائے گا۔ یہ کھُلی ہوئی تحریف معنوی ہے۔ روایت کے آخری الفاظ اس خیال کی تردید کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔

صبح کو جاتی اور شام کو واپس آتی ہیں (انما تغدو وتروح فی طلب الرزق)[1]

جہاں تک علاج و معالجہ کا معاملہ ہے وہ بھی خلاف توکّل نہیں ہے۔ اس بارے میں صوفیہ کا طرز عمل صریحاً سنّت نبوی کے خلاف ہے۔ اس سلسلے میں چند روایتیں ملاحظہ ہوں:

(۱) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:[2]

ما انزل اللّٰہ داء الا انزل معہ شفاء

اللہ نے کوئی بیماری نہیں پیدا فرمائی جس کی دوا نہ پیدا کی ہو۔

(۲) حضرت اسامہ بن شریک سے روایت ہے کہ:

عن اسامہ بن شریک قال اتیتُ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم واصحابہ کانما علی رؤسھم الطیر فسلّمتُ ثم قعدت فجاء الاعراب من ھاھنا فقالوا یا رسول اللّٰہ أنتداوی؟ فقال تداووا فان اللّٰہ تعالیٰ لم یضع داء الّا وضع لہ دواء غیر داء واحد: الھرم[3]

اسامہ بن شریک فرماتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، آپ کے اصحاب اس طرح ساکت و صامت تھے کہ گویا ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوں، پس میں نے سلام کیا اور بیٹھ گیا، اتنے میں کچھ بدوی آگئے انھوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول کیا ہم علاج کریں؟ آپ نے فرمایا: ضرور علاج کرو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری نہیں بنائی جس کی دوا نہ پیدا

---

[1] ابن حجر عسقلانی، فتح الباری جلد ۱۱ ص ۳۰۵

[2] صحیح بخاری (کتاب الطب) نسائی و ابن ماجہ (فی الطب)

[3] صحیح بخاری، کتاب الطب، مرتّبہ محدث سہارنپوری ج ۲ ص ۸۴۷ و جامع ترمذی (طبع میرٹھ) ج ۲ ص ۲۶ و سنن ابن ماجہ، ابواب الطب (طبع دہلی) ص ۲۵۳ و سنن ابوداؤد، کتاب الطب ج ۲ ص ۱۸۳

کی ہو بجز ایک بیماری کے اور وہ بڑھاپا ہے۔"

(۳) حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ احد کے دن ایک انصاری کے زخم سے بدبو نکلنے لگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے دو طبیب بلوائے اور فرمایا کہ اس کا علاج کرو (عالجاہ) ان دونوں نے کہا:

یارسول اللہ! انا کنا نعالج ونحتاز فی الجاهلية فلما جاء الاسلام فما هو الا التوكل فقال: عالجاه، فان الذی انزل له الداء ثم جعل فيه شفاء فعالجاه فبرأ[1]

اے اللہ کے رسول ہم جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کا علاج و معالجہ کرتے تھے لیکن اب جبکہ اسلام آگیا ہے تو صرف توکّل کافی ہے۔ آپ نے فرمایا: اس کا علاج کرو اس لیے کہ جس نے اس کے لیے بیماری پیدا کی ہے اس کے لیے شفا بھی رکھی ہے۔ ان دونوں نے علاج کیا اور وہ (انصاری) اچھے ہو گئے۔

زید بن اسلم سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو اصحاب زخمی ہو گئے۔ خون کسی طرح رُکا تو بنی اُنمار کے دو آدمیوں کو بلوایا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:

أيكما أطبُّ؟ فقال احدهما: أو فى الطب خيرٌ يا رسول الله؟ فقال النبی: ان الذی انزل الداء هو الذی انزل الدواء[2]

تم میں ماہر طبیب کون ہے؟ ان میں سے ایک نے کہا: اے اللہ کے رسول کیا طب میں بھلائی ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے بیماری پیدا کی ہے اسی نے دوا بھی پیدا کی ہے۔

---

[1] حاکم نے تخریج کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے، ابن السنی نے بھی حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔

[2] مرسل ہے امام مالک نے موطا (۱۲-۱۷) باب تعالج المریض میں اس کی تخریج کی ہے۔

توکّل کا قرآنی تصوّر

توکّل کے غیر قرآنی تصوّر کی تردید کے بعد اب ہم قرآن مجید کے تصوّر توکّل کو پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم توکّل کی بحث کے شروع میں بتا چکے ہیں، توکّل ایمان باللہ کا لازمی جزء ہے اس کے بغیر نہ کسی کا ایمان معتبر ہے اور نہ اسلام۔ ایک شخص جب اللہ پر ایمان لاتا ہے تو گویا وہ تسلیم کرتا ہے کہ تنہا وہی ایک ذات اس کی خالق و مالک اور بلا شرکت غیرے کائنات کی مقتدر اعلیٰ اور حاکم علی الاطلاق ہے اور وہی بالاستقلال انسانوں کے نفع و نقصان کی ذمّہ دار بھی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا اس کے اذن کے بغیر نہ کسی کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اس تسلیم و رضا کا لازمی تقاضا ہے کہ بندۂ مومن ہر حال اور ہر معاملے میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد رکھے اور دل سے اس پر بھروسہ کرے۔

لیکن اس اعتماد و توکّل کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سعی و تدبیر سے غافل ہو جائے۔ اور یہ سوچ کر بیٹھ رہے کہ اللہ مالک الملک اس کی ضرورتوں کو ضرور پورا کرے گا اور ہر مصیبت سے اس کی حفاظت کرے گا۔ جس اللہ تبارک و تعالیٰ پر وہ ایمان رکھتا ہے اسی نے یہ تعلیم دی ہے کہ توکّل نفی تدبیر کا نام نہیں بلکہ تدبیر کے ساتھ اس کے اوپر بھروسہ رکھنے کا نام ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ ۭ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۭ وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ (آل عمران: ۱۵۹، ۱۶۰)

جب تم (کسی کام کے کرنے کا) پختہ ارادہ کر لو تو پھر اللہ پر بھروسہ کرو، بیشک اللہ متوکّلین کو پسند کرتا ہے۔ اگر اللہ کی نصرت تمہیں حاصل ہو تو پھر کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور اگر وہ تم کو (بے سہارا) چھوڑ دے تو اس کے بعد

کون ہے جو تمھاری مدد کرسکے اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

اس آیت کے مطابق ایک مومن کا توکّل عزم وارادہ اور سعی وجہد سے بے نیاز نہیں ہوتا بلکہ ہر ممکن تدبیر کے بعد جب وہ کسی کام کی انجام دہی کا عزم کرلیتا ہے تو پھر اللہ کی ذات پر بھروسہ کرکے میدانِ عمل میں داخل ہوجاتا ہے۔ سیاق وسباق سے بالکل ظاہر ہے کہ آیت کا تعلق جنگ میں فتح وشکست سے ہے اور صاف طور پر کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جس کے حق میں وہ فتح کا فیصلہ کردے اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا اور جسے وہ شکست سے دوچار کرنا چاہے اسے کوئی فتح سے ہمکنار نہیں کرسکتا ہے اس لیے اہل ایمان کو صرف اسی کی ذات پر اعتماد وتوکّل رکھنا چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اہلِ ایمان حربی تدابیر سے غافل ہوجائیں۔ اگر اس کا یہ مفہوم ہوتا تو " عزمت " کا لفظ نہ آتا۔ اس لفظ سے اقدام وارادہ ظاہر ہوتا ہے اور اس کے لیے مناسب تدابیر کا اختیار کرنا ناگزیر ہے۔

یہ بات کہ توکّل اور تدبیر لازم وملزوم ہیں، آیات ذیل سے بالکل واضح ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ج لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ج اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ط هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ○

(الانفال: ۶۰ تا ۶۲)

جس قدر تمھارے امکان میں ہو قوت (یعنی ہتھیار) اور پلے ہوئے گھوڑے (ان سے مقابلہ کے لیے) تیار رکھو۔ ان کے ذریعہ تم ہراساں رکھو ان کو جو اللہ کے دشمن ہیں۔ اور ان کے علاوہ دوسروں کو بھی جن سے تم بے خبر ہو لیکن اللہ

انھیں جانتا ہے۔ اور اللہ کی راہ میں تم جو کچھ بھی خرچ کروگے وہ تم کو پورا لوٹا دیا جائے گا اور تمھارے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہوگی۔ اگر وہ (کفار) صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو، بے شک وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اور اگر ان کا ارادہ یہ ہے کہ تم کو دھوکا دیں تو تمھارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی ہے جس نے تم کو اپنی (غیبی) امداد اور مومنین (کی ظاہری امداد) سے قوت دی۔

اس ضمن میں یہ آیت بھی ملاحظہ ہو:

وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ج وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ط (النّسآء: ۱۰۲)

اور جب تم ان میں موجود ہو پھر ان کو نماز پڑھانا چاہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تو تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور وہ لوگ ہتھیار لیے رہیں پھر جب یہ لوگ سجدہ کر چکیں تو تمھارے پیچھے چلے جائیں اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے (پہلے لوگوں کی جگہ) آجائے اور تمھارے ساتھ نماز ادا کرے اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار لے لیں۔ کفار چاہتے ہیں کہ تم لوگ اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامانوں سے ذرا غافل ہو جاؤ تو تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔

اگر توکّل کا مفہوم ترکِ تدبیر ہوتا تو اوّل الذکر آیت میں مسلمانوں سے یہ نہ کہا جاتا کہ وہ جنگ کے لیے ضروری ساز و سامان ہمہ وقت تیار رکھیں۔ اگر ایک طرف مسلمانوں کو جنگی قوت فراہم کرنے کے لیے کہا گیا ہے تو دوسری طرف یہ بھی فرمایا گیا

ہے کہ وہ اللہ کی ذات پر بھروسہ کریں گویا مومن نہ تدبیر سے غافل ہوتا ہے اور نہ توکّل سے بے نیاز، وہ ان دونوں ہتھیاروں سے کام لیتا ہے۔

مؤخّرالذکر آیت میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ میدان جنگ میں عبادت کے وقت بھی اسلحہ کو لیے رہیں اور ہر طرح ہوشیار رہیں۔ کیا یہ پیش بندی اور احتیاطی تدبیر توکّل کے خلاف کہی جاسکتی ہے؟ تدبیر اور توکّل میں جو ایک لطیف ربط ہے اس کی طرف اللہ کے ایک نبی نے ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے:

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝

(یوسف: ۶۷)

اور اس نے کہا: تم سب ایک ہی دروازہ سے (شہر میں) داخل نہ ہونا بلکہ متفرّق دروازوں سے جانا۔ میں اللہ کے (فیصلہ) کے مقابلے میں تمھارے کسی کام نہیں آسکتا، فیصلہ کرنا بس اللہ کا کام ہے، (اس ظاہری تدبیر کے باوجود) میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

ایک جلیل القدر پیغمبر یعنی یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ جب وہ غلّہ لینے کے لیے مصر میں داخل ہوں تو کس تدبیر سے داخل ہوں، لیکن اس تعلیم تدبیر کے فوراً بعد یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ اس تدبیر سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں اللہ کے کسی فیصلہ کو ٹال سکتا ہوں، انسان صرف تدبیر کا مکلّف ہے، فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس خوبصورتی سے اللہ کے اس پیغمبر نے تدبیر اور توکّل کے باہمی ربط کی وضاحت کی ہے اس سے بہتر اس کی وضاحت ممکن نہیں ہے۔

توکّل کی روح

ہم نے جہاں تک قرآن مجید کا مطالعہ اور اس کی آیات میں تدبّر کیا ہے اس سے ہم اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ توکّل کی اصل روح غیر اللہ کے خوف کا دل سے نکال دینا ہے یعنی ایک مومن کے دل میں یہ خیال کبھی نہ گذرے کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی مخلوق خواہ وہ کسی مقام و مرتبہ پر فائز ہو، اس کو ادنیٰ نقصان بھی پہنچا سکتی ہے یا اس کے حکم کے بغیر اس کو کوئی فائدہ پہنچانے پر قادر ہے۔ ہر قسم کے نفع و ضرر کا سر رشتہ اللہ مالک الملک کے ہاتھ میں ہے اس لیے کسی مخلوق سے خوف کھانا یا اس سے کسی نفع کی اُمید رکھنا توکل علی اللہ کے منافی ہے۔ قرآن مجید میں توکل کی اس روح کو بکثرت آیات میں بیان کیا گیا ہے، چند آیات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنَ ۝ (یونس: ۷۱)

تم ان کو نوح کا قصّہ پڑھ کر سُنا دو، جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم اگر (تمھارے درمیان) میری موجودگی اور اللہ کی آیات کے ذریعہ میری پند و موعظت تم پر گراں گزرتی ہے تو میرا بھروسہ تو اللہ پر ہے، تم (مجھ کو ضرر پہنچانے کی) اپنی تدبیر کر لو اور اپنے شرکاء کو بھی اکٹھا کر لو پھر تمھاری (وہ) تدبیر تمھارے لیے وجہ اضطراب نہ ہو (یعنی یہ نہ کیا اور وہ نہ کیا) پھر میرے ساتھ (جو کچھ کرنا ہے) کر گزرو اور مجھ کو ذرا بھی مہلت نہ دو۔

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ۭ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۭ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝
(الزمر: ۳۸)

ان سے کہہ دو کہ کیا کبھی تم نے سوچا کہ اللہ کے سوا تم جن معبودوں کو پکارتے ہو، اگر اللہ تعالیٰ مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو کیا وہ معبود اس کی دی ہوئی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں؟ یا اللہ تعالیٰ میرے ساتھ مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ معبود اس کی عنایت و رحمت کو روک سکتے ہیں۔ کہہ دو کہ میرے لیے اللہ کافی ہے، اسی پر متوکلین کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

(۳) مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنَ ○ اِنِّيْ
تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ط (ھود: ۵۵، ۵۶)

اللہ کے سوا تم سب مل کر میرے خلاف ہر خفیہ تدبیر کر لو اور مجھ کو ذرا بھی مہلت نہ دو، میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا بھی مالک و آقا ہے اور تمہارا بھی۔

(۴) فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰىٓ اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ
فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ط وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي
الْاَرْضِ ج وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ○ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ
اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ○
فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ
الظّٰلِمِيْنَ ○ (یونس: ۸۳ تا ۸۵)

موسیٰ پر اس کی قوم کے تھوڑے لوگ ہی ایمان لائے تھے وہ بھی فرعون اور اپنے حکام سے ڈرتے کہ مبادا انھیں مبتلائے اذیت کرے اور بلاشبہ فرعون کو ملک میں بالادستی حاصل تھی اور وہ (طاقت کے مظاہرہ میں عدل کے) حدود سے تجاوز کر جاتا تھا۔ موسیٰ نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے مطیع و فرماں بردار ہو تو اسی پر بھروسہ کرو۔ انھوں نے کہا: ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا، اے ہمارے آقا! ہم کو ان ظالم لوگوں کی اذیت کا تختۂ مشق نہ بنا۔

(۵) اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ
بِضَآرِّهِمْ شَيْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ط وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

الْمُؤْمِنُوْنَ ○ (المجادلۃ : ۱۰) ۔

بے شک سرگوشی شیطان کا کام ہے تاکہ اہلِ ایمان کو رنج پہنچائے حالانکہ اللہ کے اذن کے بغیر وہ ان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا ہے اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے ۔

توکّل کی جس روح کا اوپر ذکر ہوا اس کا سب سے عمدہ مظاہرہ ہم کو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتا ہے اور اس باب میں آپ ہی کا اُسوہ لائق تقلید ہے ۔ اس سلسلے میں آپ کی زندگی سے چند واقعات یہاں پیش کیے جاتے ہیں :

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ سے ہجرت فرمائی تو غار ثور میں پناہ لی، اہل قریش ہر طرف آپ کی تلاش میں سرگرم تھے اتفاقاً چند قریشی قدموں کا نشان دیکھ کر غار ثور کے دہانے تک پہنچ گئے ، حضرت ابوبکر نے جو غار میں آپ کے ساتھ تھے ، گھبرا کر عرض کیا " یا رسول اللہ، دشمن اس قدر قریب آگئے ہیں کہ اگر ذرا نیچے جُھک کر دیکھیں گے تو ہم پر نظر پڑ جائے گی " آپ نے پرسکون آواز میں فرمایا:
لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰـهَ مَعَنَا " غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے "[1]

(۲) غزوۂ نجد سے واپسی میں آپ نے ایک مقام پر پڑاو کیا، یہاں بہت سے درختوں کا جُھنڈ تھا ، دوپہر کا وقت تھا ، صحابہ درختوں کے سائے میں ادھر ادھر سو رہے تھے ، آپ بھی ایک درخت کے نیچے تنہا استراحت فرماتے، آپ کی تلوار ایک درخت سے لٹک رہی تھی ، ناگاہ ایک بدّو جو تاک میں تھا ، آیا اور آپ کی تلوار اتار کر نیام سے باہر کی اور آپ کے سامنے آکر کہا : اے محمد اب مجھ سے تم کو کون بچا سکتا ہے ؟ آپ نے نہایت پُراعتماد لہجہ میں فرمایا " اللہ "[2]

(۳) سراقہ بن مالک بن جعشم کا بیان ہے جو مکہ سے ہجرت کے موقع پر انعام کے

---

[1] صحیح بخاری ومسلم (ہجرت)

[2] صحیح بخاری ، کتاب الجہاد

لالچ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری کے لیے نکلا تھا کہ "میں نے پانسہ کے ذریعہ فیصلہ چاہا۔ منع آنے کے باوجود آگے بڑھا اور اتنا قریب پہنچ گیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت سُن رہا تھا (حتی اذا سمعت قرأۃ رسول اللہ) لیکن وہ میری طرف مطلق متوجہ نہ ہوتے تھے البتہ ابوبکر برابر میری طرف دیکھا کرتے تھے (وھو لا یلتفت وابوبکر یکثر الالتفات)[1]"

توکّل کی یہی روح یعنی غیر اللہ سے بے خوفی کبھی مسلمانوں کا سرمایۂ زندگی تھا جس نے انھیں دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب وسربلند کیا اور آج اسی دولت سے تہی دامن ہوجانے کی وجہ سے سارے جہاں میں کثرت تعداد کے باوجود ذلیل وخوار ہیں۔

(۵) کسی وسیلہ کے بغیر اللہ سے سوال کرنا

توحید کا ایک اہم تقاضا استعانت باللہ ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، لیکن استعانت کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ایک اللہ سے مانگا جائے بلکہ یہ بھی اس میں شامل ہے کہ کسی وسیلہ اور واسطہ کے بغیر اس سے مانگا جائے۔ اس معاملے میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جادۂ حق سے ہٹا ہوا ہے۔ اس میں کچھ مسلمان وہ ہیں جو اللہ کے بجائے اولیاء اور بزرگانِ دین سے براہ راست مانگتے ہیں کیونکہ ان کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ارض وسماء پر حاکم ومتصرّف ہیں۔ یہ کھُلا ہوا کفر وشرک ہے اور اس کی تردید کے لیے کسی دلیل وحجّت کی ضرورت نہیں ہے اور ایسے لوگ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

ایک بڑی تعداد ان مسلمانوں کی ہے جو مانگتے تو اللہ سے ہیں لیکن نبی یا ولی کے وسیلہ سے مانگتے ہیں مثلاً یوں دعا کرتے ہیں " اے اللہ تو اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا فلاں نبی یا ولی کے وسیلہ سے ہماری دعا قبول فرما اور ان کے طفیل میں ہماری فلاں

---

[1] صحیح بخاری، باب ہجرۃ النبی واصحابہ الی المدینہ ج ۱ ص ۲۱۶

تکلیف رفع کردے یا فلاں حاجت پوری کردے۔" اور بعض اس طرح دعا کرتے ہیں " اے فلاں بزرگ یا ولی آپ اللہ کے محبوب بندے ہیں، اللہ کے یہاں آپ کا مقام و مرتبہ نہایت بلند ہے، آپ اللہ سے ہمارے حق میں سفارش کردیں تو ہماری مراد برآئے یا ہماری مشکل حل ہو جائے کیونکہ وہ آپ کی سنتا اور مانتا ہے۔"

دعا کے یہ سارے طریقے غیر شرعی ہیں۔ کسی کے وسیلہ سے دعا مانگنا تو اس لیے غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو کسی کے وسیلہ سے مانگنے کی تعلیم نہیں دی ہے۔ جیساکہ قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ○ (البقرة: ۱۸۶)

جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو انھیں بتا دو کہ میں ان سے بالکل قریب ہوں، جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو اس کی دعا قبول کرتا ہوں، پس ان کو چاہیے کہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ راہ راست پالیں۔

دوسری جگہ ہے:

اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ○

مجھے پکارو میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا، جو لوگ میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں اور اکڑتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں ذلت کے ساتھ داخل ہوں گے۔

ان آیات سے تین باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ اللہ اپنے بندوں سے دور نہیں ہے بلکہ ان کے بہت قریب ہے اور جب کوئی بندہ اسے پکارتا ہے تو وہ اس کی پکار کو سنتا اور اسے شرف قبولیت عطا کرتا ہے بشرطیکہ بندہ حتی الوسع اس کا

مطیع و فرماں بردار بھی ہو، دوسری بات یہ کہ دعا یعنی پکارنا بھی عبادت میں داخل ہے[1] جو شخص اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کو پکارتا ہے وہ اس کا عابد ہے۔ اور تیسری بات یہ کہ مذکورہ آیات میں کسی وسیلہ اور واسطہ کا ذکر نہیں ہے یعنی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اللہ کو کسی کے وسیلہ سے پکارو بلکہ محض یہ کہا گیا ہے کہ اسے پکارو جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اسے براہ راست پکارو، اگر بالواسطہ پکارنا مقصود ہوتا تو اس کی وضاحت آیت میں ضرور کر دی جاتی۔

قرآن مجید میں بہت سے انبیاء اور صلحاء کی دعائیں مذکور ہیں مثلاً کسی نے غلطیوں اور کوتاہیوں سے عفو و درگذر کی دعا کی ہے (بقرہ : ۲۸۶) کسی نے اولاد مانگی ہے (الصافات : ۱۰۰) کسی نے اولاد کو اللہ کی راہ میں نذر کرنے کی دعا مانگی ہے (آل عمران : ۳۵) کسی نے بیماری سے شفا کی التجا کی ہے (الانبیاء : ۸۳) کسی نے مصیبت میں مبتلا ہونے کے بعد اس سے گلو خلاصی کی دعا کی ہے (الانبیاء : ۸۷)۔ کسی نے میدانِ جنگ میں صبر و نصرت کی دعا کی ہے (بقرہ : ۲۵۰) کسی نے عمل صالح اور شکر نعمت کی دعا کی ہے (زخرف[2] : ۱۳) کسی نے مغفرت اور رحم کی دعا کی ہے (مومنون : ۱۰۹) کسی نے عذاب جہنم سے پناہ مانگی ہے (فرقان : ۶۵) کسی نے کفر و ضلالت اور شرک سے بچنے کی دعا کی ہے (آل عمران :) کسی نے دنیا و آخرت میں بھلائی کی دعا کی ہے (بقرہ : ۲۰۱) کسی نے ماں باپ کے حق میں خیر کی دعا کی ہے (اسراء : ۲۴) کسی نے بیوی اور بچوں کے باعث راحت ہونے کی دعا کی ہے (فرقان : ۷۴) کسی نے علم میں اضافے کی دعا کی ہے (طٰہٰ : ۱۱۴) کسی نے ہدایت پر استقامت کی دعا کی ہے (آل عمران : ۸) کسی نے سلطانِ وقت

---

[1] ایک حدیث میں ہے "الدعاء مخ العبادۃ" اور دوسری حدیث میں ہے "الدعاء ھو العبادۃ"

[2] مزید دیکھیں : سورہ نمل : ۱۹ ، احقاف : ۱۵

کی مدد و حمایت کے حصول کی دعا کی ہے (النسآء : ۷۵) کسی نے شیطان کے فتنوں سے بچنے کی دعا کی ہے (مؤمنون : ۹۷) کسی نے قوت گویائی میں اضافہ کی دعا کی ہے (طٰہٰ : ۲۸) غرضیکہ دنیا اور آخرت دونوں سے متعلق بہت ساری دعائیں مانگی گئی ہیں، لیکن ایک دعا بھی کسی کے وسیلہ سے نہیں مانگی گئی ہے بلکہ ساری دعائیں براہِ راست اللہ تعالیٰ سے ہیں۔ قرآن مجید کی یہی تعلیم ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارا جائے مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (جن : ۱۸)

پس اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو

شوکانی نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے[1]:

"فلا تدع مع اللہ احدًا" من خلقہ کائنا من کان

اللہ کے ساتھ اس کی مخلوق میں سے کسی کو نہ پکارو خواہ وہ کوئی بھی ہو۔

جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کسی کے وسیلہ کے بغیر دیتا ہے تو پھر وسیلہ سے مانگنا جہل بھی ہے اور اس کی صفت بخشش کی توہین بھی۔ اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک نام کریم ہے جس کے ایک معنی بغیر وسیلہ اور سفارش کے دینے والے کے ہیں، امام غزالی فرماتے ہیں[2]:

"کریم وہ ہے جو قدرت کے ہوتے ہوئے معاف کر دے، وعدہ کرے تو وفا کرے، جب دے تو امید سے زیادہ دے اور یہ پرواہ نہ کرے کہ کس قدر دیا، اور جب ضرورت اس کے غیر کی طرف لے جائے تو راضی نہ ہو، اور جب جفا کرے تو عتاب کی حد تک رہے استقصار نہ کرے، جو اس کے ساتھ چمٹ جائے اس کا ہو جائے اور اس کو ضائع

---

[1] فتح القدیر طبع مصر ۱۳۸۳/۱۹۶۴ء ج ۵ ص ۳۰۷

[2] امام غزالی، المقصد الاسنیٰ شرح الاسماء الحسنیٰ مطبوعہ مصر ص ۷۵

نہ کرے، وسیلوں اور سفارشیوں سے اس کو بے نیاز کر دے (یغنیہ عن الوسائل والشفعاء) جس ذات میں یہ تمام اوصاف جمع ہوں (بلاکسی سعی و جہد یعنی تکلیف کے) وہ کریم مطلق ہے اور وہ فقط اللہ کی ذات ہے۔"

شوکانی نے اس لفظ کی وضاحت اس طرح کی ہے[1]:

والکریم، المتفضل علی خلقه بکل خیر من غیر سوال ولا وسیلة

الکریم، مخلوق پر ہر طرح کا فضل بلاسوال اور وسیلہ کرنے والا۔

وسیلہ سے دعا مانگنا سنّت نبوی کے بھی خلاف ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کے وسیلہ سے دعا نہیں مانگی حتیٰ کہ اپنے جدّامجد حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کا وسیلہ بھی اختیار نہیں کیا، جو کچھ مانگا اللہ تعالیٰ سے براہِ راست مانگا۔ قرآن مجید میں متعدد دعائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہیں لیکن کسی ایک میں بھی وسیلہ کا ذکر نہیں۔ یہی طرز عمل آپ کے اصحاب کا تھا۔ اگر مخلوق کے وسیلہ سے دعا مانگنے میں کوئی خیر ہوتا تو اس کے سب سے زیادہ مستحق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے لیکن کسی صحابی نے نہ آپ کی زندگی میں اور نہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے وسیلہ سے دعا مانگی، امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں[2]:

لم تکن الصحابة یفعلونه فی الاستسقاء ونحوه لا فی حیاته ولا بعد مماته لا عند قبره ولا غیر قبره ولا یعرف هذا فی شئ من الادعیة المشهورة بینهم

استسقاء وغیرہ میں صحابہ نے ایسا نہیں کیا، نہ آپ کی زندگی میں اور نہ آپ کی وفات

---

[1] تحفۃ الذاکرین شرح عدۃ الحصن الحصین ص ٦٦

[2] التوسل والوسیلۃ ص ٥٣

کے بعد، نہ قبر کے پاس اور نہ کسی اور جگہ، ان کے ہاں جتنی دعائیں مشہور ہیں کسی میں بھی اس قسم کی بات موجود نہیں ہے"۔

دعا کا وہ طریقہ جس میں اولیاء اور بزرگانِ دین کو اللہ کے یہاں سفارشی سمجھ کر ان کو وسیلہ بنایا جاتا ہے، سراسر ایک مشرکانہ طریقہ ہے۔ قرآن مجید کی ایک سے زیادہ آیات میں ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، کہ مشرکین مکہ اللہ تعالیٰ کو صرف زمین اور آسمانوں کا خالق ہی نہیں مانتے تھے بلکہ اسی کو پانی برسانے والا اور احیاء و اماتت کا اختیار رکھنے والا، رزق رساں اور پناہ دہندہ بھی سمجھتے تھے (یونس: ۳۱ و عنکبوت: ۶۲) ان کا شرک صرف یہ تھا کہ انھوں نے بعض مخلوقات کو اپنا کارساز (ولی) بنالیا تھا لیکن یہ کارسازی بھی براہ راست نہ تھی یعنی وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے اولیاء براہ راست ان کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کرتے ہیں بلکہ ان کو اللہ کے دربار میں اپنا سفارشی مانتے تھے کہ وہ اللہ تک ان کی رسائی کرادیں گے یعنی اللہ سے کہہ کر ان کی حاجات پوری کرادیں گے۔ جیسا کہ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ ○

(الزمر: ۳)

اور وہ لوگ جنھوں نے اللہ کے علاوہ اور کارساز بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرادیں، بے شک اس چیز میں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں (قیامت کے روز) اللہ ان کے درمیان فیصلہ کردے گا، اللہ کسی ایسے شخص کو راہ ہدایت نہیں دکھاتا جو دروغ گو اور حد سے زیادہ منکرِ حق ہو۔

مشرکین مکہ کے اس باطل عقیدے کی وضاحت کرتے ہوئے شارحِ طحاویہ نے لکھا ہے:[1]

---

[1] شرح العقیدۃ الطحاویہ، مطبوعہ بیروت ۱۳۹۱ھ ص ۷۹

ولم يكونوا يعتقدون فی الاصنام انها شارکة فی خلق العالم بل کان حالهم فیها کحال امثالهم من شرک الامم من الهند والترک والبربر وغیرهم تارة یعتقدون ان هذه تماثیل قوم صالحین من الانبیاء والصالحین ویتخذونهم شفعاء ویتوسلون بهم الی اللہ وهذا کان اصل شرک العرب۔

"اصنام کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ وہ تخلیق عالم میں شریک ہیں بلکہ ان کا حال دوسری اقوام، ہندوں، ترکوں اور بربروں کی طرح تھا۔ ان کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ یہ انبیاء اور صلحاء قوم کے مجسّمے ہیں اور ان کو وہ اپنا سفارشی سمجھتے تھے اور اللہ تک رسائی کے لیے ان کا وسیلہ اختیار کرتے تھے اور عربوں کا بھی اصلی شرک یہی تھا۔"

اب تک جو گفتگو ہم نے کی ہے اس سے کسی کے وسیلہ سے دعا مانگنے کی مکمل طور پر نفی ہو جاتی ہے لیکن قائلین وسیلہ چونکہ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں قرآن مجید اور احادیث سے دلیلیں لاتے ہیں اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان دلائل کی غلطی بھی ان پر واضح کر دی جائے۔ وسیلہ کے اثبات میں عام طور پر قرآن مجید کی درج ذیل آیت پیش کی جاتی ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ
وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (المائدہ: ۳۵)

اے ایمان والو! اس کی نافرمانی سے بچو اور اس کا قرب ڈھونڈو اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا کرو تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو جائے۔

اس آیت سے وسیلہ کے حق میں استدلال کرنا بدترین تحریف معنوی ہے۔ لغت، تفاسیر، حدیث اور سیاق آیت کسی ایک سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی کہ آیت میں وسیلہ سے اشخاص کا ذریعہ تلاش کرنا مراد ہے۔

لغت میں وسیلہ کے ایک معنی قربت کے ہیں توسل الیّ بکذا ای تقرب یعنی میرے قریب ہوا۔[1] مفردات راغب (ص ۵۴۵) اور صحاح جوہری (ج ۵ ص ۱۸۴۱) میں بھی یہی معنی ہیں۔ لسان العرب (ج ۱۱ ص ۷۲۴) میں ہے: الوسیلة المنزلة عند الملك والوسیلة الدرجة والوسیلة القربة " وسیلہ بادشاہ کے یہاں منزلت، درجہ اور قربت کے معنی میں آتا ہے۔ قاموس (ج ۴ ص ۶۴) اقرب الموارد (ج ۲ ص ۱۴۵۲) اور منجد (ص ۹۰۰) میں بھی یہی معنی لکھے ہیں۔

وسیلہ کے دوسرے معنی ذریعۂ تقرب کے ہیں، منجد میں ہے: الوسلة والوسیلة بمعنی ذریعۂ تقرّب، التعریفات للجرجانی (ص ۱۴۷) میں ہے: الوسیلة هی مایتقرب الی الغیر " جو کسی تک جانے کا ذریعہ ہو" صراح (ص ۴۴۷) میں ہے: توسیل توسل " نزدیکی جستن بچیزی "

مذکورہ لغوی معانی کے مطابق " ابتغوا الیه الوسیلة " کے معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی قربت تلاش کرو یا اللہ کے یہاں ذریعۂ قربت ڈھونڈو۔ اس ذریعۂ قربت سے اعمالِ صالحہ مراد ہیں۔ جوہری نے صحاح (ج ۵ ص ۱۸۴۱) میں لکھا ہے: والتوسیل والتوسل واحد، یقال وسل فلان الی ربه وسیلة وتوسل الیه بوسیلة ای تقرب الیه بعمل " توسیل اور توسل کے ایک ہی معنی ہیں، وسل فلان الی ربه وسیلة وتوسل الیه یعنی عمل کے ذریعہ اس کا قرب حاصل کیا "

لسان العرب (ج ۱۱ ص ۷۲۴) میں ہے: وتوسل الیه بوسیلة، اذا تقرب الیه بعمل یعنی عمل کے ذریعہ اس کا قرب حاصل کیا۔ قاموس (ج ۴ ص ۶۷) میں ہے: ووسل الی اللّٰہ تعالیٰ توسیلا، عمل عملاً تقرب به الیه کتوسل یعنی ایسا عمل کیا جس کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کر لیا۔ تاج العروس (ج ۸ ص ۱۵۴)

---

[1] ابن قتیبہ، غریب القرآن ص ۱۴۳

میں بھی اسی طرح ہے۔ مصباح (ج ۲ ص ۳۳۶) میں ہے: وتوسل الی ربہ بوسیلۃ، تقرب الیہ بعمل یعنی عمل کے ساتھ اس کا قرب حاصل کیا۔ امام راغب مفردات (ص ۵۴۵) میں فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے فرمایا، وابتغوا الیہ الوسیلۃ۔ اللہ کی طرف وسیلہ کی حقیقت یہ ہے کہ علم وعبادت اور مکارم شریعت پر عمل کیا جائے اور یہی قربت کے معنی ہیں"

اس لغوی تشریح سے واضح ہوگیا کہ اللہ کی قربت کا ذریعہ اشخاص نہیں بلکہ اعمال نیک ہیں۔ مفسرین نے بھی وسیلہ کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں:[۱]

واطلبوا القربۃ الیہ بعمل بما یرضیہ والوسیلۃ ھی الفعیلۃ من قول القائل توسلت الی فلان بکذا ای تقرب الیہ منہ قول عنترہ:

ان الرجال لھم الیك وسیلۃ ان یاخذوك تکحّلی وتخضّبی

یعنی بالوسیلۃ القربۃ

"اللہ کے پسندیدہ عمل کے ذریعہ اس کا قرب حاصل کرو۔ وسیلۃ، فعیلۃ کے وزن پر ہے۔ توسلت الی فلان بکذا یعنی میں نے اس کا قرب حاصل کیا، عنترہ کہتا ہے: ان الرجال لھم الیك وسیلۃ ان یاخذوك تکحّلی وتخضّبی یعنی بالوسیلۃ القربۃ "بے شک مردوں کو تیرے قرب کی حاجت ہے جس سے وہ تیری طرف جھکتے ہیں، تو سرمہ اور مہندی لگا، یعنی وسیلہ قرب"

اس سلسلے میں امام رازی نے لکھا ہے:[۲]

فکان المراد طلب الوسیلۃ الیہ فی تحصیل مرضاتہ وذالك بالعبادات والطاعات

"مطلب یہ ہے کہ اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے ذریعہ تلاش کیا جائے اور

۱؎ تفسیر طبری، مطبوعہ مصر ۱۳۸۸/۱۹۶۸ء ج ۵ ص ۲۲۶

۲؎ تفسیر کبیر، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت ج ۱۱ ص ۲۲۰

یہ ذریعہ عبادات اور طاعات ہیں۔"

نسفیؒ فرماتے ہیں[۱]:

ھی کل مایتوسل بہ ای یتقرب من قرابۃ اوصنیعۃ او غیر ذلک فاستعیرت لمایتوسل بہ الی اللہ تعالیٰ من فعل الطاعات وترک السیئات

"وسیلہ ہر وہ چیز ہے جس سے قرب حاصل ہو پھر اللہ کی فرماں برداری اور ترک عصیاں کے لیے جس کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے، وسیلہ مستعار لیا گیا ہے۔"

بیضاویؒ لکھتے ہیں[۲]:

ای ماتتوسلون بہ الی ثوابہ والزلفیٰ من فعل الطاعات وترک المعاصی، من وسل الی کذا اذا تقرب

"یعنی وہ کام جن کو ثواب اور قرب کا ذریعہ بنایا یعنی اطاعت کے کام اور ترک معاصی۔ وسل الی کذا یعنی اس کا قرب حاصل کیا۔"

علامہ آلوسیؒ اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں[۳]:

وابتغوا الیہ ای اطلبوا لانفسکم الیٰ ثوابہ والزلفیٰ منہ، الوسیلۃ ھی فعیلۃ بمعنی مایتوسل بہ ویتقرب الی اللہ عزّوجلّ من فعل الطاعات وترک المعاصی، من وسل الی کذا ای تقرب الیہ بشیٔ

"وابتغوا الیہ یعنی اپنے لیے ثواب اور اس کا قرب چاہو، وسیلۃ فعیلۃ کے وزن پر ہے

۱؎ تفسیر نسفی، مطبوعہ مصر دار احیاء الکتب العربیہ ج ۱ ص ۲۸۲

۲؎ انوار التنزیل واسرار التاویل المعروف بالتفسیر البیضاوی، مطبوعہ منشی نول کشور لکھنؤ ج ۱ ص ۲۲۴

۳؎ روح المعانی، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المصطفائیہ، دیوبند، یوپی ج ۶ ص ۱۲۴

یعنی اطاعت اور ترک معاصی کے وہ کام جن کو اللہ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ وسل الی کذا کے معنی ہیں کہ کسی چیز کے ساتھ اس کا قرب حاصل کیا۔"

صاحب جلالین فرماتے ہیں:[1]

وابتغوا الیہ الوسیلۃ مایقربکم الیہ من طاعتہ

"وابتغوا الیہ الوسیلۃ یعنی اس کی اطاعت جو تم کو اس کے قریب کردے۔"

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے:[2]

قال ابن عباس: ای القربۃ وقال قتادہ: ای تقربوا الیہ بطاعتہ والعمل بما یرضیہ

"ابن عباس نے فرمایا کہ وسیلہ کے معنی قربت کے ہیں، اور قتادہ نے کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ اللہ کا قرب تلاش کرو اطاعت اور ان اعمال سے جو اس کو محبوب ہیں۔"

مذکورہ تفسیری اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ علماء تفسیر نے کسی استثناء کے بغیر وسیلہ سے عبادات اور اعمال صالحہ مراد لیے ہیں نہ کہ اشخاص کا ذریعہ جیساکہ وسیلہ کے قائلین کہتے ہیں۔ احادیث میں بھی وسیلہ کا یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں ابو وائل سے روایت کیا ہے کہ:[3]

"وسیلہ یعنی عمل کے ساتھ تقرّب حاصل کرنا۔ عطاء، حسن اور عبداللہ بن کثیر نے بھی یہی معنی بیان کیے ہیں۔ سدی نے کہا ہے کہ وسیلہ قربت کو کہتے ہیں اور قتادہ فرماتے ہیں کہ اطاعت اور وہ اعمال جن

---

[1] تفسیر جلالین، مطبوعہ مطبع مجیدی کانپور ص ۹۳

[2] مختصر تفسیر ابن کثیر، بیروت ۱۴۰۲/۱۹۸۱ء الطبع السابعۃ ج ۱ ص ۵۱۳

[3] تفسیر طبری ج ۵ ص ۲۲۶

سے وہ راضی ہوتا ہے اس کا تقرّب حاصل کرو، مجاہد سے روایت ہے: وسیلہ سے مراد اللہ کا قرب حاصل کرنا ہے"۔

اگر وسیلہ کے قائلین صرف آیۂ زیر بحث کے سیاق و سباق ہی پر غور کر لیتے تو حق ان پر واضح ہو جاتا، لیکن مقصود حق کی تلاش و طلب نہیں بلکہ اپنے مزعومہ عقیدے کے حق میں ہر ممکن دلیلیں تراشنا ہے۔

آیۂ " وابتغوا الیہ الوسیلۃ "سے پہلے کی آیات میں ان سرکش یہودیوں کا ذکر ہے جو اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کر کے زمین میں فتنہ و فساد پھیلانے میں مشغول تھے ان کو دنیا و آخرت دونوں میں رسواکن عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ اس تنبیہ و تہدید کے بعد روئے سخن اہلِ ایمان کی طرف مڑ گیا ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ وہ یہودیوں کے برخلاف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں (یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ) اور پھر اس کے قرب کی جستجو اور اس کی راہ میں جہاد کی ہدایت کی گئی ہے۔ (وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ) گویا اس کے قرب کے دو ذریعے ہوئے ایک تقویٰ یعنی اس کے احکام کی اطاعت اور دوسرا جہاد فی سبیل اللہ، انہی دونوں ذریعوں کو اختیار کر کے ایک بندۂ مومن اللہ کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔

اگلی آیات میں روئے سخن پھر منکرینِ حق یعنی یہودیوں کی طرف ہو گیا ہے اور انھیں خبردار کیا گیا ہے کہ عذاب جہنّم سے بچانے والی چیز محض تقویٰ ہے اس کے علاوہ کوئی شے بھی انھیں جہنّم کی آگ سے بچا نہیں سکتی ہے حتّٰی کہ اگر وہ روزِ آخرت عذاب جہنّم سے بچنے کے لیے سارے جہاں کے خزانے بھی دینا چاہیں گے تو قبول نہ کیا جائے گا۔

امام رازی آیۂ مذکورہ کی شرح میں فرماتے ہیں[1]:

---

[1] تفسیر کبیر ج ۳ ص ۵۸۸

كانه قيل قد عرفتم كمال جسارة اليهود على المعاصى والذنوب وبُعدهم عن الطاعات التى هى وسائل للعبد الى الرب فكونوا ايها المومنون با لضد من ذاك وكونوا متّقين عن معاصى اللّٰه متوسلين الى اللّٰه بطاعات اللّٰه

"گویا کہ کہا گیا کہ تم جانتے ہو کہ یہودی گناہ اور معاصی پر کس قدر جسارت کرتے ہیں اور اطاعت سے دور ہیں جو بندے کے لیے قرب الٰہی کے وسائل ہیں، اے ایمان والو! تم ان کے خلاف بنو اور اللہ کی نافرمانی سے بچو اور اس کی اطاعت و فرماں برداری کے وسیلہ سے اللہ کا قرب حاصل کرو۔"

اگر آیت میں وسیلہ سے اشخاص کا وسیلہ مراد لیا جائے تو نظم کلام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ایک طرف یہ فرمانا کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور پھر یہ حکم کہ اشخاص کا وسیلہ ڈھونڈو اور اللہ کی راہ میں جدو جہد کرو، ایک بے جوڑ بات ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جن اولیاء اور بزرگانِ دین کا وسیلہ اختیار کرنے کی بات کہی جاتی ہے ان کا حال قرآن مجید نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ط اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ○ (بنی اسرائیل: ۵۶، ۵۷)

ان سے کہو کہ جن کو تم اللہ کے سوا (مشکل کشا) قرار دیتے ہو ذرا اُن کو پکارو تو سہی فی الواقع وہ نہ تم سے تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ (اس کے) بدل ڈالنے کا (یعنی راحت سے) یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں وہ خود ہی اپنے رب تک رسائی کا ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب

بنتا ہے، وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے
ڈرتے ہیں، بلاشبہ تمہارے رب کا عذاب ہے ہی ڈرنے کے قابل۔

اس آیت سے قطعیت کے ساتھ واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن لوگوں کو اس خیال کے ساتھ پکارا جاتا ہے کہ وہ اللہ سے سفارش کر کے ان کی تکلیف کو دور کرا دیں گے وہ ان کی تکلیف دور کرنے کی بالکل طاقت نہیں رکھتے اور نہ اس بات کی طاقت رکھتے ہیں کہ کسی کو اللہ سے قریب کر دیں، کسی کو قریب کرنا تو درکنار وہ خود اللہ کے قرب و رحمت کے طلبگار اور اس کے عذاب سے خائف رہتے ہیں (ویرجون رحمته ویخافون عذابه)

قائلین وسیلہ اپنے نقطۂ نظر کے احقاق میں جن احادیث کو پیش کرتے ہیں وہ سب بے اصل ہیں۔ چنانچہ وہ روایتیں جن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے (یعنی بحق محمد جیسے الفاظ کے ساتھ) دعا کرنے کا ذکر ہے جبکہ آپ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے سراسر جھوٹی روایتیں ہیں۔ حاکم نے مستدرک (ج ۲ ص ۶۱۵) میں آدم علیہ السلام کی دعائے استغفار سے متعلق جو روایت بیان کی ہے وہ اسی قبیل کی ہے۔ علماء حدیث نے اس روایت کے کذب وضعف کو بیان کر دیا ہے۔[1]

یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ کسی ایک روایت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کو وسیلہ بنانے کا ذکر نہیں ملتا خواہ کوئی نبی ہو یا ولی اس لیے کسی غائب یا مردہ شخص کے وسیلہ سے دعا کرنے کا جواز احادیث سے بھی ثابت نہیں ہوتا۔

بعض روایتوں میں زندہ اشخاص کے وسیلہ سے دعا کرنے کا ذکر ضرور ملتا ہے جن میں سے دو روایتیں قابل ذکر ہیں، ایک روایت وہ ہے جو ایک نابینا صحابی سے متعلق ہے اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کرنے

---

[1] دیکھیں، امام ابن تیمیہ، الرد علی البکری ص ۶ تا ۹ مطبوعہ مصر و ابن الجوزی، الموضوعات ج ۳ ص ۴۷ ، ۱۰۱ اس قسم کی روایتیں حدیث کی کسی معتبر کتاب میں موجود نہیں ہیں۔

کا ذکر ہے[۱] اس روایت کو ترمذی نے اپنی سنن (ج ۲ ص ۱۹۷) میں، حاکم نے مستدرک (ج ۱ ص ۵۲۶) میں، ابن ماجہ نے اپنی سنن (ص ۱۰۰) میں، اور احمد نے مسند (ج ۴ ص ۱۳۸) میں بیان کیا ہے۔ لیکن یہ خبر واحد ہے اور اس کے متن میں بھی اضطراب ہے اس لیے علماء احناف نے اسے قابل حجت نہیں مانا ہے۔ اس سلسلے میں امام بخاری نے تاریخ کبیر میں جو روایت نقل کی ہے وہ صحیح ہے اور اس سے واقعہ کی صحیح نوعیت معلوم ہوتی ہے، فرماتے ہیں[۲]:

قال شهاب حدثنا حماد بن سلمه عن ابی جعفر الخطمی عن عمارة بن خزیمه بن ثابت عن عثمان بن حنیف اتی اعمی النبی صلی الله علیه وسلم فقال: ادعو الله تعالیٰ ان یرد بصری قال: او ادعك، قال: بل ادعو الله قال ثلاثا، ثم قال: توضأ وصل رکعتین وقل اللهم انی اسئلك واتوجه الیك، نفعل فردّ بصره

شہاب نے کہا ہم سے حماد بن سلمہ نے روایت کی، انھوں نے ابو جعفر خطمی سے انھوں نے عمارۃ بن خزیمہ سے، انھوں نے عثمان بن حنیف سے کہ ایک

---

۱ روایت یہ ہے کہ ایک نابینا آیا اور آپ سے بینائی کی واپسی کے لیے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو دعا کر دوں اور اگر صبر کرے تو تیرے لیے بہتر ہے۔ نابینا نے کہا کہ دعا کیجیے۔ آپ نے اسے اچھی طرح وضو کرنے کا حکم دیا اور پھر کہا کہ اس طرح دعا کرو "اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف آپ کے نبی محمد نبی رحمت کے ساتھ توجہ کرتا ہوں، میں آپ کے ساتھ آپ کے اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ میری یہ ضرورت پوری فرما، اے اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش میرے حق میں قبول فرما"۔ (مسند احمد ۴/۱۳۸ مستدرک حاکم ۱/۵۲۶ سنن ابن ماجہ ۱/۴۴۱ (۱۳۸۵) البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔ دیکھیے صحیح ابن ماجہ (۱۱۳۷-۱۳۸۵)

۲ تاریخ کبیر ج ۳ ص ۲۰۹ (ق ۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا، اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ
میری بصارت لوٹا دے، آپ نے فرمایا میں تمھیں ترک دعا کے لیے کہوں گا۔
اس نے تین بار کہا، بلکہ اللہ سے دعا کیجیے، فرمایا، وضو کر اور دو رکعت صلاۃ پڑھ
اور کہہ اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں
اس نے ایسا ہی کیا اور اس کی بینائی واپس آگئی۔

دوسری روایت وہ ہے جس میں ابن عباسؓ کے وسیلہ سے دعا کا ذکر ہے
اور جسے امام بخاری نے اپنی صحیح میں انس بن مالکؓ سے اس طرح روایت کیا ہے[۱]:

"جب قحط سالی ہوتی تو عمر بن الخطاب عباس بن عبدالمطلب کو
دعا کے لیے کہتے اور فرماتے اے اللہ ہم تیرے پاس اپنے نبی صلی اللہ
علیہ وسلم کو وسیلہ بناتے تھے اور تو ہم کو بارش عطا فرماتا تھا اب ہم
اپنے نبی کے چچا کو وسیلہ بناتے ہیں پس ہم کو بارش عطا فرما اور وہ
بارش سے سیراب کر دیے جاتے۔"

اس روایت سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ کہ کسی زندہ شخص کے وسیلہ سے جو
بوقت دعا موجود ہو، دعا کی جاسکتی ہے۔ اس میں صاحب وسیلہ کی وہی حیثیت
ہے جو عام نمازوں میں امام نماز کی ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ صلاۃ میں امام اسی شخص
کو بنایا جاتا ہے جو سب سے زیادہ عالم اور متقی ہو۔ اس لیے آفات (قحط وغیرہ) میں
بھی دعا کے لیے اسی شخص کا انتخاب کیا جائے گا جو سب سے زیادہ متقی ہو۔[۲]

۱۔ صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۲۳ مطبوعہ مصر ۱۳۵۱/ ۱۹۳۲ء

۲۔ امام بخاری نے دعائے استسقاء کے لیے جو باب باندھا ہے وہ یہ ہے: باب سوال
الناس الامام الاستسقاء اذا قحطوا " لوگوں کا امام سے استسقاء کا سوال کرنا جب بارش نہ ہو"
امام بیہقی نے یوں باب لگایا ہے: باب الاستسقاء بمن ترجی برکتہ ودعائہ " اس سے دعائے استسقاء
کرانا جس کی دعا کی برکت کی امید ہو"

اس روایت سے کسی مردہ شخص کے وسیلہ سے دعا کا جواز ثابت نہیں ہوتا بلکہ تردید ہوتی ہے۔ اگر مردہ کے وسیلہ سے دعا جائز ہوتی تو حضرت عمر فاروق رضؓ اور دوسرے صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر حضرت عباس بن عبدالمطلب کو وسیلہ نہ بناتے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے حضرت عباسؓ کے وسیلہ سے دعا کرنا خود ثابت کرتا ہے کہ کسی غائب کے وسیلہ سے دعا جائز نہیں ہے۔

وسیلہ کے قائلین "اولیاء اللہ" کو مردہ تصوّر نہیں کرتے بلکہ زندہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کے وسیلہ سے دعا کرنا جائز قرار دیتے ہیں اور مذکورہ روایت کو بطور ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اگر ان کے خیال کے مطابق اولیاء اللہ اپنی قبروں میں زندہ ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدرجۂ اولیٰ زندہ ہوں گے پھر صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے حضرت عباس کے وسیلہ سے کیوں دعا کی؟ سوال قبروں میں کسی کے زندہ یا مردہ ہونے کا نہیں ہے بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کیا ان کے وسیلہ سے دعا کی جا سکتی ہے اور کیا وہ دعا کرنے والوں کی اللہ سے سفارش کرتے ہیں؟ ان دونوں باتوں کی تائید نہ تو قرآن مجید سے ہوتی ہے اور نہ ہی حدیث اور آثار صحابہ سے اس لیے یہ بالکل غلط اور اسلام کے تصوّر توحید کے سراسر منافی ہے۔

روایتوں سے جو بات ثابت ہے وہ بس یہ کہ بندہ اپنے اعمال صالحہ کے وسیلہ سے اللہ سے دعا کر سکتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ کوئی نیک عمل دیکھو

لہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے کسی نیک بندے نے جن میں بزرگان دین بھی شامل ہیں، اپنے متبعین کو یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ وہ ان کی وفات کے بعد ان کے وسیلہ سے دعائیں مانگیں یا ان کو اللہ کے یہاں سفارش کرنے والا سمجھ کر ان سے مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لیے کہیں۔ جو لوگ اس طرح کی باتیں ان کی طرف منسوب کر کے عامۃ المسلمین کو گمراہ کرتے ہیں وہ ان کے بھی دشمن ہیں اور دینِ اسلام کے بھی۔ ہر مسلمان یہ بات یاد رکھے کہ شرک کے مرتکب پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے۔ (المائدہ : ۷۲)

جو تم نے اللہ کے لیے کیا ہے تو اس کے وسیلہ سے دعا کرو۔ ایک اور روایت میں ہے تمھیں کوئی چیز نجات نہیں دے سکتی ہے بجز اس کے کہ اللہ کو اپنے صالح اعمال کے ساتھ پکارو، ایک روایت میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اپنے اچھے اچھے اعمال سوچو اور ان کے ساتھ دعا کرو شاید اللہ تعالیٰ تمھاری مصیبت رفع کر دے"[1]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ دعا کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی مردہ اور زندہ[2] کے وسیلہ کے بغیر اللہ تعالیٰ سے براہِ راست مانگا جائے، اور اگر دعا میں کسی شے کا وسیلہ اختیار کیا جا سکتا ہے تو وہ خود صاحبِ دعا کے اپنے نیک اعمال ہیں۔ اس کے علاوہ دعا کا ہر طریقہ غیر شرعی ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ مشرکانہ ہے تو زیادہ صحیح ہوگا۔

(۶) محبّتِ الٰہی

توحید کا ایک اہم تکوینی تقاضا اللہ کی محبّت ہے۔ لیکن اس محبّت کا کیا مفہوم ہے اس کی وضاحت ضروری ہے کیونکہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد محبّتِ الٰہی کے صحیح مفہوم سے واقف نہیں ہے[3]

محبّت دلی تعلق کو کہتے ہیں خواہ یہ تعلق کسی انسان سے ہو یا غیر انسان سے۔ اس محبّت کے دو جزء ہیں، ایک قولی محبّت اور دوسرا قلبی محبّت۔ اگر قولی محبّت کے ساتھ قلبی محبّت شامل نہیں ہے تو ایسی محبّت ناقابلِ اعتبار ہے کیونکہ یہ عین ممکن

۱؎ دیکھیں، فتح الباری ج ۷، ص ۳۱۷ (مطبوعہ مصر)

۲؎ اجتماعی دعا اس سے علٰحدہ ہے جیسا کہ حضرت انس بن مالک سے مروی روایت میں گذر چکا ہے۔ (بخاری) کیونکہ اس قسم کی دعا کسی کے وسیلہ کے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہ وسیلہ امام صلاۃ ہوتا ہے۔

۳؎ ہمارے بہت سے علماء بالخصوص صوفیہ نے محبّت الٰہی (یا ان کی زبان میں عشق الٰہی) کا جو مفہوم بیان کیا ہے اس میں مادی محبت (محبت طبعی) کا تصوّر غالب ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ مادی وجود نہیں رکھتا اس لیے محبت الٰہی کے مادی یا طبعی تصوّر کو درست نہیں کہا جا سکتا ہے۔

ہے کہ کوئی شخص زبان سے کسی کی محبّت کا دعویدار ہو لیکن اس کا دل محبّت سے خالی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ دل میں محبت کے بجائے نفرت و عداوت کی آگ سُلگ رہی ہو۔ اس لیے جب تک محبّت کا عملی مظاہرہ نہ ہو یعنی قلبی محبّت اس وقت تک قولی محبّت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

قولی محبّت کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے محبوب کی مدح و ستائش کی جائے، اس کے اوصاف کمالات بیان کیے جائیں، اس کی عظمت کے قصیدے پڑھے جائیں نیز اس کی محبّت میں جان و مال کو نثار کرنے کا دعویٰ کیا جائے، اور قلبی محبّت یہ ہے کہ محبّت کرنے والا صرف زبان ہی سے محبوب کی عقیدت و محبت اور اس کی اطاعت کا دم نہ بھرے بلکہ اپنے عمل سے بھی اس کا ثبوت فراہم کرے۔ دوسرے لفظوں میں محب محبوب کا اس درجہ تابع فرمان ہو جائے کہ اس کے دل میں محبوب کی حکم عدولی کا کبھی خیال تک نہ آئے۔ جب بھی محبوب کی زبان سے کوئی حکم صادر ہو یا اسے معلوم ہو جائے کہ یہ اس کے محبوب کی مرضی ہے وہ فوراً صدائے لبیک کہے اور اس کی تعمیل میں لگ جائے۔ اگر دل سچّی محبّت سے پر جوش نہ ہو تو خواہش کے باوجود اس نوع کی کامل اطاعت کا مظاہرہ کسی جھوٹے شخص کے لیے ممکن نہ ہو گا۔ محبّت کے اس حقیقی مفہوم کے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں: [1]

> "دیکھیے کہ عاشق کو معشوق سے کس قسم کا تعلق ہوتا ہے اور اس کے دل میں معشوق کی کتنی عظمت و وقعت ہوتی ہے۔ کیا اگر معشوق یہ حکم دے کہ تم میرے پاس آؤ یا گرمی کے وقت چلچلاتی ہوئی دوپہر میں چار کوس تک برہنہ پا چلے آؤ تو کیا عاشق انکار کرے گا یا اس سے اس حکم کے مصالح پوچھے گا۔ اگر اس کا عشق سچا ہے تو بلانے سے دوڑا ہوا آئے گا۔ اگر کوئی روکنا بھی چاہے تو ہرگز نہ رُکے گا۔ غرض کسی قسم کے امر و نہی میں

---

[1] مولانا عبدالباری، تجدید تصوف و سلوک، مطبوعہ نامی پریس لکھنو ۱۹۴۹ء ص ۱۳۴

اس کو ذرا بھی پس و پیش نہ ہوگا . . . . سب جانتے ہیں کہ انسان
کو جس سے محبّت ہوتی ہے تو اس کی یاد کسی وقت دل سے نہیں
اترتی اور دوسرے اس کے ہر حکم کو گوشِ قبول سے سنتا ہے۔ کبھی ایسا
نہیں ہوتا کہ عاشق سے محبوب کے کسی حکم میں بھول چوک یا نافرمانی
کا ظہور ہو کیونکہ بھول ہمیشہ اس کام میں ہوتی ہے جس کی جانب
پوری توجہ نہ ہو اور جو چیز ہر وقت قلب پر مستولی ہو اس میں بھول
کا ہونا عادۃً ممکن نہیں "

اللہ کی محبّت میں جسے اصطلاحِ شریعت میں حبِّ ایمانی کہتے ہیں، قولی اور قلبی دونوں طرح کی محبّت داخل ہے۔ اس میں ذرا بھی تفریق روا نہیں۔ اللہ کی محبّت کے معنی یہ ہیں کہ اسے کثرت سے یاد کیا جائے، اس کی عظمت و بزرگی بیان کی جائے، اس کی مدح و ثنا میں مبالغہ کیا جائے، اس کے آگے بے تابانہ سرِ نیاز جھکایا جائے اور ساتھ ہی اس کی رضا و خوشنودی کی خاطر اس کا ہر حکم خوشی خوشی بجالایا جائے۔ قرآن مجید میں محبّتِ الٰہی کا ذکر ایک سے زیادہ مقامات پر آیا ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط (البقرۃ: ۱۶۵)

اہلِ ایمان کو اللہ ہی سے قوی محبّت ہوتی ہے۔

فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ لا
(المائدہ: ۵۴)

پس اللہ بہت جلد ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جن سے وہ محبّت کرے گا اور وہ
اس سے محبت کریں گے۔

ان آیات میں حبِّ الٰہی سے کیا مراد ہے اس کے بارے میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں کہی ہیں لیکن خود قرآن مجید نے اس کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ یہ ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(آل عمران: ۳۱)

(اے محمد) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے فی الواقع محبّت کرتے ہو تو میری اتّباع کرو اللہ تم سے محبّت کرنے لگے گا۔

اس آیت نے حب الٰہی کے مفہوم کو بالکل واضح کر دیا ہے یعنی رسول کی اتّباع۔ جو شخص اللہ سے محبّت کرنا چاہتا ہے وہ محض قولی[1] محبّت یعنی اس کے ذکر و تسبیح پر قناعت نہ کرے بلکہ رسول کی اتّباع کو بھی لازم جانے۔ اگر کوئی شخص محبّت الٰہی کے دعویٰ کے باوجود اس کے رسول کی اتّباع نہیں کرتا ہے تو اس کی محبّت کو جھوٹ پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ آدمی کسی سے واقعی محبّت کرتا ہو اور پھر بھی اس کی بات نہ مانے۔ محبوب کی حکم عدولی محبّت کے جھوٹ ہونے کی دلیل ہے خواہ محبّت کرنے والا زبان سے محبوب کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ہی کیوں نہ ملا دے۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ رسول کی اتّباع کا مطلب دراصل وحی الٰہی کی اتّباع ہے اور یہ معلوم ہے کہ وحی الٰہی بادشاہ حقیقی کا فرمان ہے۔ اگر کسی کو بادشاہ حقیقی سے واقعی محبّت ہے تو اسے اس کے فرمان سے بھی یقیناً محبّت ہوگی اور وہ اس کی تعمیل میں جوش و سرگرمی دکھائے گا۔ اس اہم حقیقت کو ایک جگہ ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ يَجِدُوْنَهٗ
مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ

---

[1] آج کل صرف قولی محبّت پر زور دیا جاتا ہے جسے دیکھیے ایک ہاتھ کی تسبیح لیے مصروف سبحہ گردانی ملے گا لیکن عملی زندگی میں اتباع رسول نام کی کوئی چیز مشکل سے ملے گی۔

عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(الاعراف : ۱۵۷)

جو لوگ اس رسول یعنی نبی اُمّی کی اتباع کرتے ہیں جس کو وہ اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ یہ رسول ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور بدی سے روکتا ہے، پاکیزہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو ان کے لیے حرام ٹھہراتا ہے اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق (ان کی وضع کردہ شریعت) تھے ان سے ان کو نجات دیتا ہے۔ پس جو لوگ اس رسول پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی نصرت و حمایت کرتے ہیں اور اس نور (قرآن مجید) کی اتباع کرتے ہیں جو اس کے ساتھ بھیجا گیا ہے، وہی لوگ فلاح یافتہ ہیں۔

اس آیت کی ابتدا میں رسول کی[1] اتّباع کا ذکر ہے اور پھر کہا گیا ہے کہ نور یعنی قرآن مجید کی اتّباع کی جائے۔ گویا یہ اتّباع رسول کی وضاحت ہے اسی لیے بعض مقامات پر صرف قرآن مجید کی اتّباع کا ذکر ہے مثلاً ایک جگہ ہے:

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (الانعام : ۱۵۵)

اور یہ (قرآن مجید) ایک خیر و برکت والی کتاب ہے جسے ہم نے بھیجا ہے پس اس کی اتّباع کرو اور اس کی خلاف ورزی سے بچو تاکہ تم پر رحمت نازل کی جائے۔

بندوں سے اللہ کی محبّت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ان کا خیر خواہ، ان کے حال پر مہربان اور ان کا کفیل و نگراں بن جائے

---

[1] علماء کبار کا اس بات پر اتّفاق ہے کہ سنّت قرآن مجید کی شرح و وضاحت ہے۔ اس وضاحت کا تعلق آیات احکام کے عملی پہلوؤں سے ہے اس لیے قرآن کریم کے ساتھ اس کی اتّباع بھی واجب ہے۔

(ب) تشریعی تقاضے[1]

یہ ایک حقیقت ہے جیساکہ ہم آگے چل کر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے، کہ عالم تکوینی کی طرح عالم تشریعی میں بھی اللہ تعالیٰ ہی مقتدر اعلیٰ اور حاکم علی الاطلاق ہے۔ اس لیے ہر صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ عالم تشریعی میں بھی اسی کو حاکم علی الاطلاق تسلیم کرے اور اسی کو اصلی شارع و قانون ساز مان کر اس کے بنائے ہوئے قوانین و احکام کے مطابق حتیّ الوسع اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی گذارے۔ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات پر تشریعی تقاضے کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ط وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ

---

[1] توحید کے تشریعی تقاضوں کے بارے میں علماء کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ علماء جو تصوف کے دلدادہ ہیں وہ بالعموم تشریعی تقاضوں سے صرف نظر کر جاتے ہیں کیونکہ انسان کی اجتماعی زندگی یعنی سیاسی و معاشی اُمور ان کے دائرہ فکر سے خارج ہیں۔ ان کے نزدیک دین نام ہے اللہ اور بندے کے درمیان باطنی تعلق کا اور یہ فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن جو علماء دین کو وسیع تناظر میں دیکھنے کے عادی ہیں ان کے یہاں توحید کے تشریعی تقاضے کی اہمیت تکوینی تقاضوں سے کچھ کم نہیں ہے بلکہ بعض کے یہاں اس سے بڑھ کر ہے۔

دیگر اُمور کی طرح اس معاملے میں بھی علماء افراط و تفریط کی راہ میں گامزن ہیں۔ توحید کے تکوینی اور تشریعی دونوں تقاضے اپنی اپنی جگہ بے حد اہم ہیں لیکن ان دونوں میں جو ربط باہمی ہے اس کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ تشریعی تقاضے جس طرح تکوینی تقاضوں سے جڑے ہوئے ہیں اس کو مؤخّرالذکر گروہ کے علماء بالعموم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔ ہم نے تشریعی تقاضوں سے متعلق آگے جو کچھ لکھا ہے اس میں اس ربط و تعلق کو پورے طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ہیں کیونکہ اللہ کے قانون سے زیادہ عادلانہ قانون کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا ہے، ظالم اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ اللہ کے قانون کی جگہ کسی فرد واحد یا کسی انسانی جماعت کے وضع کردہ قانون کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں اور دوسروں کو بھی اس ظلم کی راہ دکھاتے ہیں۔ ظلم کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ کسی چیز کو اس جگہ رکھ دیا جائے جو اس کا حقیقی محل نہ ہو، بھلا اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا کہ اللہ کے قانون کی جگہ انسان کا قانون لے لے۔ اور فاسق کہنے کی وجہ تو بالکل ظاہر ہے۔

قرآن مجید کی اس وضاحت کے بعد کسی صاحب ایمان کے لیے یہ کہنا جائز نہ ہوگا کہ عالم تشریعی کا حاکم و قانون ساز اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا بھی ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں[۱]:

"اسی طرح وہ حکومت کے متعلق یہ اعلان کرتا ہے کہ کائناتِ انسانی یا انسانی جماعت کو براہِ راست یہ منصب حاصل نہیں ہے کہ وہ حاکمیتِ مطلقہ کا دعویٰ کرے بلکہ خدائے تعالیٰ جس طرح خالقِ کائنات ہے اسی طرح حاکم علی الاطلاق بھی ہے اور حکومت بلاشرکتِ غیرے اسی کو حاصل ہے، اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے[۲]:

"اقتدارِ اعلیٰ کی وحدانیت کا اقتضا یہ ہے کہ حاکمیت و فرماں روائی کی جتنی قسمیں ہیں سب ایک ہی مقتدرِ اعلیٰ کی ذات میں مرکوز ہوں اور حاکمیت کا کوئی جزو بھی کسی دوسرے کی طرف منتقل نہ ہو۔ جب خالق وہ ہے اور خلق میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے، جب رازق وہ ہے اور رزق رسانی میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں،

۱؎ اسلام کا معاشی نظام، مولوی محمد حفظ الرحمٰن، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۴۶ء ص ۱۱۹

۲؎ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص ۲۴، ۲۵

جب پورے نظام کائنات کا مدبّر و منتظم وہ ہے اور تدبیر و انتظام میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں تو یقیناً حاکم و آمر اور شارع بھی اسی کو ہونا چاہیے۔ جس طرح اس کی سلطنت کے دائرے میں اس کے سوا کسی دوسرے کا فریاد رس اور حاجت روا اور پناہ دہندہ ہونا غلط ہے اسی طرح کسی دوسرے کا مستقل بالذّات حاکم اور خود مختار فرمانروا اور آزاد قانون ساز ہونا بھی غلط ہے۔"

دوسری جگہ فرماتے ہیں[1]:

"ربوبیت ناقابل تقسیم ہے، اس کا کوئی جزو کسی معنی میں بھی کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے، کائنات کا نظام ایک کامل مرکزی نظام ہے جس کو ایک ہی خدا نے پیدا کیا، جس پر ایک ہی خدا فرماں روائی کر رہا ہے، جس کے سارے اختیارات و اقتدارات کا مالک ایک ہی خدا ہے، نہ اس نظام کے پیدا کرنے میں کسی دوسرے کا کچھ دخل ہے نہ اس کی تدبیر و انتظام میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کی فرمانروائی میں کوئی حصّہ دار ہے، مرکزی اقتدار کا مالک ہونے کی حیثیت سے وہی اکیلا خدا تمھارا فوق الفطری رب بھی ہے اور اخلاقی و تمدنی اور سیاسی رب بھی، وہی تمھارا معبود ہے، وہی تمھارے سجدوں اور رکوعوں کا مرجع ہے، وہی تمھاری دعاؤں کا ملجا و ماویٰ ہے، وہی تمھارے اعتماد و توکل کا سہارا ہے، وہی تمھاری ضرورتوں کا کفیل ہے، اور اسی طرح وہی بادشاہ ہے۔ وہی مالک الملک ہے، وہی شارع و قانون ساز اور وہی امر و نہی کا مختار بھی ہے۔"

سید قطب شہید کا بھی یہی خیال ہے کہ اللہ جس طرح انسانوں کا مافوق الفطری

---

[1] قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص ۶۴

رب ہے اسی طرح ان کی سیاسی و تمدنی زندگی کا بھی حاکم علی الاطلاق اور شارع وقانون ساز ہے ، ایک جگہ لکھتے ہیں[1]:

"ان کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اسلام اوّلاً لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کے عقیدہ کو اس کے حقیقی مدلول کے ساتھ تسلیم کرنے کا نام ہے یعنی یہ کہ اپنے سارے معاملات میں صرف خدا کی حاکمیت تسلیم کریں اور جو لوگ اس حاکمیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس پر دست درازی کرتے ہیں انھیں دھتکار دیں۔"

عالم تشریعی میں اللہ کے حاکم علی الاطلاق ہونے کا ثبوت

عالم تشریعی (سیاسی و تمدنی زندگی) میں بظاہر یہی دکھائی دیتا ہے کہ انسان ہی اصل حاکم و فرمانروا ہے لیکن جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے، عالم تکوینی کی طرح عالم تشریعی کا بھی حاکم و فرمانروا اللہ رب العزت ہے، لیکن یہ حکومت و فرمانروائی براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ہے اور یہ واسطہ خود انسان ہے۔ چونکہ اس حقیقت پر عالم تکوینی کی طرح پردہ پڑا ہوا ہے اس لیے ہر دور میں بہت سے انسان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے اور آج بھی ہیں کہ انسانوں کی اخلاقی، سیاسی اور تمدنی زندگی کے اصل حاکم وہی ہیں دوسرے لفظوں میں زمین پر انھیں جو سیاسی اقتدار حاصل ہے وہ کسی مافوق الفطری قوت کا بخشا ہوا نہیں بلکہ تمام تر ان کی سیاسی بصیرت کا نتیجہ ہے اور یہ اقتدار اس وقت تک ان کے پاس رہے گا جب تک ان کے پاس فوجی طاقت ہے یا انھیں عوام کی تائید و حمایت حاصل ہے گویا ان کے نزدیک تخت حکومت پر ان کا نصب و عزل تمام تر مادی اسباب و علل کے تابع ہے۔

لیکن وہ نہیں جانتے کہ مادی اسباب و علل ایک غیر مادی عظیم ہستی سے جڑے ہوئے

---

[1] معالم فی الطریق ص ۲۵ بحوالہ عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح ص ۴۸

ہیں اور اسی عظیم ہستی کا نام اللہ ہے۔ وہ جس وقت چاہتا ہے اسباب مادی کے پردہ میں ان کا اقتدار چھین لیتا ہے اور وہ آئینۂ حیرت بن کر رہ جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک حکمراں کے پاس مادی طاقت وقوت کے سارے سامان جمع ہیں اور بظاہر کوئی سبب ایسا نظر نہیں آتا جو اس کے اقتدار کو ختم کرنے والا ہو لیکن اچانک وہ کرسیٔ اقتدار سے ہٹا دیا جاتا ہے اور بڑے بڑے اصحاب علم اس انتقال اقتدار کی مادی توجیہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی اقتدار کا زوال و انتقال اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ عالم تشریعی کا اصلی حاکم انسان نہیں بلکہ وہ ذات واجب الوجود ہے جو کائنات کی خالق و مالک ہے۔ یہی ذات برحق عالم تکوینی کی طرح عالم تشریعی کا نظام بھی اپنی مرضی[1] و منشاء سے چلاتی ہے اور اس غرض کے لیے زمین پر برابر حکمرانوں کو بدلتی رہتی ہے۔ اس اہم حقیقت کو قرآن مجید میں ایک جگہ نہایت موثر دعائیہ اسلوب میں بیان کیا گیا ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۤءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۤءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۤءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۤءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (آل عمران: ۲۶)

کہو، اے اللہ مالک الملک تو جس کو چاہتا ہے اقتدار دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے، تو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل و رسوا کر دیتا ہے، بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

زوالِ اقتدار کی عبرت انگیز مثالوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ ہم یہاں ماضی کے صرف ایک بادشاہ فرعونِ مصر کا ذکر کرتے ہیں۔ دنیا کے دوسرے بادشاہوں کی طرح فرعونِ مصر بھی اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ وہ ملک مصر کا حاکم علی الاطلاق

---

[1] اس مرضی کا دوسرا نام قانون الٰہی ہے گویا وہ اپنے مقرر کردہ قوانین کے مطابق نظامِ عالم چلاتا ہے۔

ہے، قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○

(زخرف: ۵۱)

اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی اور کہا، اے میری قوم، کیا مصر کی سلطنت میری نہیں ہے اور یہ نہریں جو میرے قدموں تلے بہہ رہی ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟

اس نشۂ اقتدار میں وہ اس درجہ سرمست تھا کہ اپنے علاوہ کسی اور کو حاکم علی الاطلاق ماننے کے لیے تیار نہ تھا، اسے اپنے سوا کوئی دوسرا صاحبِ اقتدار وجود نظر ہی نہیں آتا تھا چنانچہ جب موسٰی علیہ السلام اس کے پاس ربِّ کائنات کا پیغام لے کر گئے تو اس نے اسے رد کر دیا اور نہایت ہی تمسخر آمیز انداز میں کہا:

وَقَالَ فِرْعَوْنُ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ فَاَوْقِدْ لِیْ یٰهَامٰنُ عَلَى الطِّیْنِ فَاجْعَلْ لِّیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ○

(القصص: ۳۸)

فرعون نے کہا: اے سرداران قوم، میں اپنے سوا کسی اور کو تمھارے الٰہ (حاکم علی الاطلاق) کی حیثیت سے نہیں جانتا، اے ہامان، میرے لیے ذرا اینٹیں پکواؤ اور ایک بلند عمارت میرے لیے تعمیر کراؤ تاکہ میں اس پر چڑھ کر موسٰی کے الٰہ کا پتہ لگاؤں، میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔

اس نے اس تخفیف واستہزاء ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ موسٰی علیہ السلام کو یہ دھمکی بھی دی کہ اگر انھوں نے اس کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا حاکم و فرمانروا مانا تو وہ انھیں قید کر دے گا:

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ ○

(الشعراء: ۲۹)

فرعون نے کہا، اگر تم نے میرے علاوہ کسی اور کو الٰہ قرار دیا تو تم کو قید
کردوں گا۔

لیکن جب ربِّ کائنات نے اسے اس کے لشکر کے ساتھ سمندر میں غرق کردیا تو اس وقت اس کے سر سے اقتدار کا کابوس اترا اور اسے معلوم ہوا کہ درحقیقت زمین کا اصلی حاکم و فرماں روا وہ نہ تھا بلکہ ربِّ کائنات تھا۔ غرقابی کے وقت اس حقیقت کو اس نے ان لفظوں میں تسلیم کیا:

قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ
وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ
مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ○ (یونس: ۹۰، ۹۱)

اس نے کہا، میں ایمان لاتا ہوں کہ بجز اس کے کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان
رکھتے ہیں، کوئی دوسرا الٰہ نہیں اور میں سر اطاعت جھکاتا ہوں (جواب دیا گیا)
اب ایمان لاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے تو مفسد و سرکش بنا رہا۔

عالم تشریعی میں اللہ کے حاکم علی الاطلاق ہونے کی حقیقت

یہ بات معلوم ہوچکی کہ عالم تشریعی کا حاکم علی الاطلاق اللہ تعالیٰ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان مجبور محض ہے جیساکہ کائنات کی دیگر اشیاء، ہیں کہ وہ بے چون و چرا خالق کائنات کے قوانین کی اتّباع کررہی ہیں اور اس سے سرموانحراف ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

انسان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ عالم تشریعی کا حاکم علی الاطلاق ہونے کے باوجود اللہ نے انسانوں کو اس بات کا اختیار بخشا ہے کہ وہ اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات کا انتظام اس کی حاکمیت مطلقہ کی بنیاد پر کریں یا اس سے آزاد ہوکر جس راہ پر چلنا چاہیں اس پر چلیں، فرمایا:

اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ○ (الدھر: ۳)

ہم نے اسے راستہ دکھا دیا ہے اب خواہ شاکر بنے (یعنی اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلے) اور خواہ کافر نعمت بنے (یعنی اس کی بتائی ہوئی راہ سے منہ موڑ کر کسی اور راہ پر چلے)

انسان کو یہ اختیار اس لیے دیا گیا ہے تاکہ اس کا امتحان ہو کہ وہ اقتدار پا کر کون سا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے یعنی اللہ کا مطیع و فرماں بردار بندہ بنتا ہے یا اس کا نافرمان بندہ، فرمایا گیا:

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ○ (یونس: ۱۴)

پھر ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ان کے بعد تاکہ دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ○

(الاعراف: ۱۲۹)

اور وہ عنقریب تم کو زمین میں خلیفہ بنائے گا پھر دیکھے گا کہ کیسا عمل کرتے ہو۔

ان آیات کے مطابق انسان اپنی تمدنی زندگی کی تشکیل کا اختیار تو رکھتا ہے لیکن یہ اختیار کس گروہ انسانی کو ملے اس کا فیصلہ اللہ رب العزت کرتا ہے۔ وہی یہ فیصلہ بھی کرتا ہے کہ کب یہ اختیار ایک گروہ سے چھین کر کسی دوسرے گروہ کے حوالہ کیا جائے۔ ہر گروہ انسانی کے لیے ایک اجل معیّن ہے جس وقت یہ اجل آجاتی ہے تو اس کے ہاتھ سے زمام اقتدار لے لی جاتی ہے، فرمایا:

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ط اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○ (یونس: ۴۹)

ہر اُمّت کے لیے ایک معیّن وقت ہے۔ جب ان کا یہ معیّن وقت آجاتا ہے تو اس وقت وہ نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔

انتقال اقتدار کا یہ الٰہی قانون اسباب کے پردے میں ظاہر ہوتا ہے۔

اربابِ نظر اس طرز جہانبانی کو سمجھتے ہیں لیکن جو نادان ہیں یا ہوائے نفسانی کے پرستار وہ اس حقیقت کے ادراک سے قاصر رہتے ہیں، وہ یہی سمجھتے ہیں کہ عالم تشریعی کا حاکم علی الاطلاق خود انسان ہے۔ ان کے نزدیک زوال و انتقالِ اقتدار کی علّتِ حقیقی سیاسی، معاشی اور معاشرتی عوامل ہیں کیونکہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ مادی اسباب و علل کے تحت ہو رہا ہے اور اللہ کا دست قدرت بظاہر کارفرما نظر نہیں آتا۔ لیکن اگر انسان مادی اسباب کے طرز وقوع پر سنجیدگی سے غور کرے تو معلوم ہوگا کہ فاعل حقیقی مادی اسباب نہیں بلکہ خالق اسباب ہے۔ عالم تشریعی میں انسان کی حیثیت بلاشبہ ناظم و حاکم کی ہے لیکن حاکم علی الاطلاق اللہ ہی ہے گویا یہ حاکمیت براہ راست نہیں بالواسطہ ہے۔

عالم تشریعی میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کو حاکم علی الاطلاق اور شارع سمجھنا شرک ہے

جس طرح عالم تکوینی میں ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کو حاکم و مقتدر اعلیٰ سمجھنا فعل شرک ہے اسی طرح یہ بھی شرک ہے کہ عالم تشریعی میں اس کے سوا کسی اور کو حاکم علی الاطلاق اور خود مختار شارع و قانون ساز مانا جائے۔ اس نوع کا شرک اشراک فی الحکم میں داخل ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی سورۂ نسآء آیت ۱۱۶ کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

> "شرک یہی نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش کرے بلکہ اللہ کے حکم کے مقابلے میں کسی کے حکم کو پسند کرنا یہ بھی شرک ہے۔"

مولانا نے سورۂ نسآء کی آخری آیت کے حاشیے اور فوائد میں بھی شرک فی الحکم پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے :

> "اللہ ربّ العٰلمین کے علاوہ اوروں کو شارع، حاکم اور قانون ساز سمجھنا اور ان کو یہ حق دینا کہ جو چاہیں قانون بنائیں یہ وہ بدترین شرک

ہے جس میں آج خود مسلمان حکومتیں بھی گرفتار ہیں اور عوام بھی اسی مشرکانہ نظام کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

ہمارے بعض جیّد علماء نے اشراک فی الحکم کو کفر کے درجے کی چیز قرار دیا ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ) قرآن مجید کی آیت "فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ: ۲۲) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں[1]

اطاعت غیر او تعالیٰ بالاستقلال نیز کفر است و معنی اطاعت غیر بالاستقلال آنست اورا مبلغ احکام دانستہ، تقلید او در گردن انداز و تقلید اور الازم شمارد و باوجود ظہور مخالفت حکم او تعالیٰ از اتّباع بر ندارد و ایں ہم نوع است از اتّخاذِ انداد کہ در آیت اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ الآیہ نکوہش آں فرمودہ اند۔

"غیر اللہ کی بالاستقلال اطاعت بھی کفر میں داخل ہے اور اطاعت غیر کا مطلب یہ ہے کہ اس کو شارع وقانون ساز مانے، اس کی تقلید کا قلاوہ گردن میں ڈال لے اور اس کی اتّباع کو لازم جانے اور حق تعالیٰ کے احکام کی کھلی مخالفت کے باوجود اس کی پیروی سے دست بردار نہ ہو۔ یہ بھی انداد سازی کی ایک قسم ہے، آیت "اتخذوا احبارھم" میں اس فعل پر اللہ تعالیٰ نے ملامت فرمائی ہے۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اسے فعل شرک قرار دیا ہے، لکھتے ہیں:[2]

" یہ اقتدار وحاکمیت ناقابل تقسیم ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے حکم کو واجب الاطاعت سمجھتا ہے تو وہ ایسا ہی شرک کرتا ہے جیسا ایک غیر اللہ سے دعا مانگنے والا شرک کرتا ہے۔

---

۱ تفسیر عزیزی سورۃ بقرہ

۲ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص ۲۵

اور اگر کوئی شخص سیاسی معنی میں مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ اور حاکم علی الاطلاق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ دعویٰ بالکل اسی طرح خدائی کا دعویٰ ہے جس طرح فوق الطبعی معنی میں کسی کا یہ کہنا کہ تمہارا ولی و کارساز اور مددگار و محافظ میں ہوں۔"

سید قطب شہید اشراک فی الحکم کے مرتکب کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ اپنی تفسیر میں ایک جگہ تشریح دین کرتے ہوئے لکھا ہے[۱]:

"جو غیر اللہ کی بڑائی تسلیم کرتا ہے اور زندگی کے کسی معاملے میں بھی غیر اللہ کو حَکَم مانتا ہے وہ نہ تو مسلمان ہے اور نہ اس دین ہی سے اس کا کوئی تعلق ہے لیکن جو صرف خدا کی حاکمیت پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ کی مخلوق میں سے کسی کی تابعداری کے لیے تیار نہیں اور نہ اس کے سامنے جھکتا ہے وہ مسلمان ہے اور اس دین میں داخل ہے[۲]۔"

اصولی حیثیت سے جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کو حاکم اور شارع و قانون ساز ماننا شرک بلکہ کفر ہے لیکن اس بات کا اطلاق احوال و ظروف کے تابع ہے۔ جن ملکوں میں مسلمان اجتماعی اقتدار نہیں رکھتے اور مختلف سیاسی نظامات کے تحت زندگی گذارنے کے لیے مجبور ہیں ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ محض سیاسی اطاعت کی بنا پر دائرہ اسلام سے خارج یا شرک کے مرتکب ہیں بڑی زیادتی کی بات ہوگی۔ البتہ جن ملکوں میں مسلمان اجتماعی اقتدار کے مالک ہیں لیکن اس کے باوجود اللہ کے قانون کو چھوڑ کر کسی اور کے قانون کی اتباع کرتے ہیں وہ یقیناً اشراک فی الحکم کے

۱؎ تفسیر فی ظلال القرآن ص ۲۰۰۔ بحوالہ عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح ص ۵۰، ۵۱

۲؎ سید قطب نے غالباً مصر کے مخصوص حالات کو سامنے رکھ کر یہ بات کہی ہے جہاں مسلمانوں کو اجتماعی اقتدار حاصل ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنی اجتماعی زندگی میں اللہ کے قانون کی تنفیذ سے غافل ہیں۔

مرتکب ہیں۔ اور اگر اس فعل میں ان کی مرضی اور خوشی بھی شامل ہے تو ایسے لوگ فی الواقع دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

کیا اشتراک فی الحکم اور اشتراک فی الالوہیت یکساں درجہ کے شرک ہیں

اوپر اشتراک فی الحکم کے سلسلے میں مختلف علماء کے جو خیالات پیش کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اشتراک فی الحکم اور اشتراک فی الالوہیت یکساں درجہ کے شرک ہیں۔ عصرِ حاضر کے معروف عالم دین مولانا ابوالحسن علی ندوی کو اس سے اختلاف ہے، فرماتے ہیں[1]:

"رہے جاہلیت کے دوسرے مظاہر جیسے غیراللہ کی اطاعت، ان کی قوت حاکمہ کو تسلیم کرنا، غیر الٰہی قوانین کو قبول کرنا اور ایسی حکومت کو تسلیم کرنا اور اس کے احکام و قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا جو خلافتِ الٰہیہ کی بنیادوں پر قائم نہ ہوئی ہو، تو یہ سب اس بُت پرستی اور شرک کے تابع ہے اور اس کا درجہ اس کے بعد ہے، یہ دین میں ایک طرح کی تحریف ہو گی کہ سابق الذکر شرک جلی (اشتراک فی الالوہیت) کی اہمیت کو کم کر دیا جائے اور دعوت و تبلیغ کے بنیادی اصولوں میں اس کو ضمنی حیثیت دی جائے یا سیاسی اطاعت و حکومت کو اور اس کو ایک درجہ میں رکھا جائے اور دونوں پر ایک ہی حکم لگایا جائے۔"

راقم سطور کو مولانا علی میاں کے خیال سے اتفاق ہے[2]۔ اس مسئلے میں اس

---

[1] عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح ص ۶۹

[2] مولانا نے اشتراک فی الالوہیت کو شرک جلی قرار دیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اشتراک فی الحکم کو شرکِ خفی سمجھتے ہیں۔ راقم سطور کو اس سے اتفاق نہیں، دونوں ہی شرک جلی ہیں البتہ اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے اوّل الذکر کی شناعت زیادہ ہے۔

بات کو نہ بھولنا چاہیے کہ گذشتہ زمانوں میں اشراک فی الحکم کی جو صورت تھی وہ اشراک فی الالوہیت سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی کیونکہ اس دور کے سلاطین ایک طرح سے معبود کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کا صرف حکم ہی نہیں مانا جاتا تھا بلکہ ان کے سامنے سر بھی جھکائے جاتے تھے، لیکن عصر حاضر میں جس نوع کی حکمرانی رائج ہے وہ اس سے قطعاً مختلف ہے۔

عصر حاضر میں فرماں روائی بالکل سیاسی ہے جس میں حاکم اور محکوم دونوں شریک ہوتے ہیں، کہیں یہ شرکت براہ راست ہے اور کہیں بالواسطہ۔ اس کے علاوہ اس دور کے حکمرانوں کو کسی معنی میں بھی "معبودیت" کا دعویٰ نہیں ہے، وہ ہرگز یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ ان کے سامنے سجدے کیے جائیں یا ان کو کسی آسمانی مخلوق کا نمایندہ تسلیم کیا جائے۔ ان کا جو کچھ مطالبہ ہے وہ سیاسی نوعیت کا ہے، یعنی یہ کہ ان کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کیا جائے اور ملکی قوانین کے مطابق اجتماعی معاملات سر انجام پائیں۔ ان کو اس بات سے مطلقاً کوئی دلچسپی نہیں کہ عام لوگ مذہبی طور پر کیا عقیدہ رکھتے ہیں اور کس معبود کی پرستش کرتے ہیں جبکہ ماضی کے حکمراں عباداتی امور میں بھی مداخلت کیا کرتے تھے۔

اس کے برخلاف اشراک فی الالوہیت کی جو شکل ماضی میں تھی وہ بڑی حد تک آج بھی موجود ہے۔ کل کی طرح آج بھی بعض وفات یافتہ لوگ الوہیت کے درجے پر فائز ہیں۔ چنانچہ ان کے مقابر و مشاہد زیارت گاہِ خلائق ہیں جہاں عبادت و تعظیم کے سارے مراسم جنھیں صرف اللہ کے لیے مختص ہونا چاہیے تھا، ادا کیے جاتے ہیں۔ ان وجوہ سے عہد حاضر میں اشراک فی الحکم اور اشراک فی الالوہیت کو یکساں نوعیت کا شرک قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔

ہماری اس گفتگو سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ہم اشراک فی الحکم کی اہمیت کو گھٹانا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک دونوں ہی بدترین شرک ہیں اور ان سے ہر مسلمان کو حتی الامکان بچنا چاہیے۔ اشراک فی الالوہیت سے ہر مسلمان ہر حالت میں بچ سکتا ہے۔

اس سلسلے میں کوئی عذر بھی روز آخرت قبول نہ کیا جائے گا کیونکہ اس راہ میں اب کوئی خارجی جبر موجود نہیں ہے۔ لیکن اشراک فی الحکم سے اجتناب کسی ایک فرد کی ذاتی خواہش پر منحصر نہیں۔ اس شرک سے اسی صورت میں بچا جا سکتا ہے جب معاشرے کی غالب تعداد اس سے بچنا چاہے ورنہ بصورت دیگر اس سے بالکلیہ دامن بچالے جانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

لیکن اس کے باوجود نظری حیثیت سے اہل ایمان پر لازم ہے کہ وہ عالم تکوین کی طرح عالم تشریعی میں بھی اللہ ہی کو حاکم علی الاطلاق، شارع اور قانون ساز مانیں اور جس حد تک ملکی و سیاسی حالات اجازت دیں اس کے قوانین کے مطابق اپنی زندگی گذاریں اور برابر اس بات کے لیے کوشش کرتے رہیں کہ اجتماعی زندگی میں اللہ کے قانون کی تعمیل میں جو موانع حائل ہیں وہ دور ہوں۔

اقامت توحید

اوپر ہم نے جس جدوجہد کا ذکر کیا ہے اس سے ہماری مراد سیاسی جدوجہد نہیں جس کے داعی و مبلغ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب دونوں ہیں یعنی مسلم حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا اور ان سے زبردستی اقتدار چھین لینا، مؤخر الذکر فرماتے ہیں[۱]:

> "سارے عالم کے لیے تنہا اللہ کی ربوبیت کے اعلان کا مطلب ہے بشر کی حاکمیت (چاہے وہ جس شکل وصورت اور نظام و فلسفہ میں جلوہ گر ہو) کے خلاف بھرپور بغاوت اور دنیا کے ہر گوشے میں اس صورتِ حال کے خلاف سرکشی و برگشتگی جس میں حاکمیت (یا دوسرے ہم معنی لفظوں میں: الوہیت) کا حق کسی نہ کسی شکل میں انسان کو حاصل ہو۔"

---

۱ معالم فی الطریق مطبوعہ ۱۳۸۶ ص ۵۹ بحوالہ عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح ص ۴۹

مزید ایک جگہ ارشاد ہے:[1]

"وہ جانتے تھے کہ الوہیت عبارت ہے حاکمیت اعلیٰ (اقتدارِ اعلیٰ) سے اور الوہیت کی وحدانیت اور اس کا سزاوار تنہا اللہ کو قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ جس حاکمیت پر کاہنوں، قبائل کے سرداروں اور امراء و حکام نے قبضہ جما رکھا ہے اسے ان سے چھین کر خدا کے حوالہ کر دیا جائے۔"

بلکہ دین کی راہ میں جدّوجہد سے ہماری مراد اقامت توحید کی جدّوجہد ہے۔ اس راہ کا پہلا اور انتہائی اہم مرحلہ دعوت و تبلیغ ہے۔ اس میں سب سے پہلے توحید کی حقیقت اور اس کے تکوینی تقاضوں کو بتایا جائے اور تکرار و تسلسل کے ساتھ بتایا جائے، اور جب تک توحید اور اس کے تکوینی تقاضوں سے مسلمانوں کے قلوب و اذہان پورے طور پر ہم آہنگ نہ ہو جائیں اس کے تشریعی تقاضوں کی تبلیغ نہ کی جائے۔ توحید کے تکوینی تقاضوں سے صرف نظر کر کے محض اس کے تشریعی تقاضوں کی تبلیغ یا اس کے عملی قیام کے لیے جدوجہد کرنا فی الواقع ریت پر محل بنانے کے مرادف ہے۔

ماضی میں مسلمانوں کی بعض حوصلہ مند دینی جماعتوں نے اقامت دین کی جدّوجہد میں اس نکتہ کو فراموش کر دیا جس کے نتیجے میں ان کی ساری جدّوجہد ان کے تمام تر خلوص اور نیک نیتی کے باوجود رائگاں گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اقامتِ دین کی سیاسی جدّوجہد جو اقامتِ توحید کا دوسرا اور آخری مرحلہ ہے، اسی وقت صحیح معنوں میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے جب اس کے داعیوں کے قلوب میں توحید کی روح (تکوینی تقاضے) اس طرح رچ بس گئی ہو جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے دلوں میں رچ بس گئی تھی۔

مسلمانوں کی دینی جماعتوں کا المیہ یہ ہے کہ ان سے وابستہ اکثر افراد کی زندگیاں

---

[1] معالم فی الطریق ص ۲۲۰ بحوالہ سابق ص ۴۷

روح[۱] توحید سے خالی نظر آتی ہیں، اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ توحید کے قرآنی تصور اور دینی جدّوجہد میں اس کی اہمیت سے پورے طور پر واقف نہیں ہیں۔ میں پورے احساس عجز کے ساتھ دوبارہ کہتا ہوں کہ جب تک دینی جماعتیں توحید کے قرآنی تصوّر اور اس کے تقاضوں کو ٹھیک طور پر نہ سمجھیں گی اور ان پر دیانت داری کے ساتھ عمل پیرا نہ ہوں گی اسلام کا اجتماعی نظام (سیاسی ومعاشی) تو کجا اس کا اخلاقی وعبادتی نظام بھی صحیح بنیادوں پر قائم نہ ہو سکے گا خواہ زبان وقلم سے کتنی ہی غوغا آرائی کی جائے۔ اس راہ میں اب تک جو ناکامیاں پیش آئی ہیں ان کی ایک بڑی وجہ اس حقیقت سے چشم پوشی ہے۔ اگر اس کی جلد اصلاح نہ کی گئی تو ناکامیوں اور نامرادیوں کا سلسلہ دراز تر ہو سکتا ہے۔

۱۔ توحید کی روح جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، غیر اللہ کے خوف کا دل سے نکال دینا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب یہ یقین دل میں پیدا ہو جائے کہ ہر طرح کے نفع وضرر کا سررشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے اذن کے بغیر نہ کسی کو نفع پہنچ سکتا ہے اور نہ نقصان۔

مــراجع

۱ - ابن خزیمہ (امام محمد بن اسحاق نیسابوری) — کتاب التوحید و اثبات صفات الرب — درب الاتراک، مصر

۲ - ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن اسحاق زجاجی — اشتقاق اسماء اللہ، تحقیق دکتور عبدالحسن مبارک — بیروت ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء

۳ - ابن منظور — لسان العرب — طبع بیروت ۱۹۵۶ء

۴ - ابن حجر عسقلانی، علامہ — فتح الباری — بیروت (الطبع الحلبی البابی)

۵ - امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا — شمائم امدادیہ — مطبوعہ خورشید بکڈپو لکھنؤ

۶ - ———————— انسائیکلوپیڈیا آف اسلام — لیڈن ۱۹۳۴ء/۱۹۶۰ء

۷ - ———————— انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مائکروپیڈیا — پندرہواں اڈیشن ۱۹۷۳ء

۸ - احمد ابن حنبل، امام — مسند ابن حنبل — مصر ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء

۹ - ابن تیمیہ، شیخ الاسلام — حقیقۃ مذہب الاتحادئین — مطبعۃ المنار مصر ۱۳۴۹

۱۰ - ″ ″ — التوسل والوسیلہ — طبع بیروت

۱۱ - ″ ″ — العقیدۃ الواسطیۃ — جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ سعودی عربیہ طبع ثانی ۱۴۰۳ھ

۱۲ - ″ ″ — الفتوی الحمویۃ الکبریٰ — قاہرہ طبع ثالث ۱۴۰۳ھ

۱۳ - ابوالبرکات نسفی، علامہ — تفسیر نسفی — طبع مصر (دار احیاء الکتب العربیہ)

۱۴ - الطاف احمد اعظمی — سورہ فاتحہ ایک تحقیقی مطالعہ — جونپور (انڈیا) ۱۹۸۷ء

۱۵ - آلوسی، علامہ — روح المعانی — ادارۃ الطباعۃ المصطفائیہ دیوبند، یوپی

۱۶ - ابوالکلام آزاد، مولانا — ترجمان القرآن — ساہتیہ اکاڈمی دہلی ۱۹۷۶ء

۱۷۔	ابوالحسن علی ندوی، مولانا	عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح	دار عرفات لکھنؤ ۱۹۷۸ء
۱۸۔	ابوالقاسم قشیری، امام	الرسالۃ القشیریہ	مصر ۱۳۰۴ھ
۱۹۔	ابن الجوزی (امام الفرج عبدالرحمٰن)	تلبیس ابلیس	قاہرہ ۱۹۵۰/۱۳۶۹ء
۲۰۔	ابن قتیبہ، علامہ	غریب القرآن	طبع مصر
۲۱۔	ابن کثیر، حافظ	مختصر تفسیر ابن کثیر	بیروت ۱۴۰۲/۱۹۸۱ء
۲۲۔	بخاری، امام محمد بن اسمٰعیل	صحیح البخاری	طبع مصر ۱۳۵۱ھ
۲۳۔	بیہقی، امام حافظ ابوبکر احمد	کتاب الاسماء والصفات	مطبع انوار احمد الٰہ آباد ۱۳۱۳ھ
۲۴۔	————	بائبل	برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور ۱۹۵۸ء (طبع لندن)
۲۵۔	جلال الدین محلی، علامہ و جلال الدین سیوطی، علامہ	تفسیر جلالین	مطبع مجیدی، کانپور
۲۶۔	جلال الدین رومی، مولانا	مثنوی معنوی	مطبوعہ لکھنؤ (منشی نولکشور)
۲۷۔	دائرۃ المعارف اسلامیہ		دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۶۸ء
۲۸۔	رازی، امام	تفسیر کبیر	مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
۲۹۔	راغب اصفہانی، امام	المفردات فی غریب القرآن	طبع مصر
۳۰۔	رضا زادہ شفیق، ڈاکٹر	تاریخ ادبیات ایران، اردو ترجمہ سید مبارز الدین	ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۸۲ء
۳۱۔	رشید رضا مصری، علامہ	تفسیر المنار	مصر ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء
۳۲۔	زمخشری، علامہ	الکشاف	دار المعرفہ، بیروت (لبنان)
۳۳۔	سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی	تاج العروس	کویت ۱۹۶۶ء
۳۴۔	سید سلیمان ندوی، مولانا	ارض القرآن	دار المصنفین اعظم گڈھ ۱۹۲۴ء
۳۵۔	〃 〃 〃	اسلام اور مستشرقین (مجموعۂ مضامین)	اعظم گڈھ ۱۹۸۵ء

۳۶ - سید صباح الدین عبد الرحمٰن	بزم صوفیہ	مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء
۳۷ - سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا	قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں	مطبوعہ دار الاسلام پٹھان کوٹ پنجاب (دوسرا اڈیشن)
۳۸ - "	تفہیم القرآن	مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۶۹ء
۳۹ - سلمان قطایۃ، الدکتور	مخطوطات الطب والصیدلۃ بحلب	۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۶ء
۴۰ - شیخ احمد بن ابراہیم شافعی صوفی تحقیق زہیر شادیش	النصیحۃ فی صفات الرب جلّ و علا	المکتب الاسلامی بیروت طبع رابع ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء
۴۱ - امام ابن أبی العزّ الحنفی	شرح العقیدۃ الطحاویہ	بیروت ۱۳۹۱ھ
۴۲ - شیخ ابوالحسن علی ہجویری	کشف المحجوب	اسلامک فاونڈیشن لاہور ۱۹۸۷ء میلادی
۴۳ - شیخ عبد القادر جیلانی	غنیۃ الطالبین	مطبوعہ رفیق عام پریس
۴۴ - شبلی نعمانی، مولانا	سیرۃ النبی	دار المصنفین اعظم گڈھ ۱۳۸۳ھ ۱۹۶۳ء
۴۵ - شیخ عبد الحق دہلوی، محدث	اخبار الاخیار	دار الاشاعت کراچی
۴۶ - شاہ عبد العزیز دہلوی، محدث	تفسیر عزیزی	مطبوعہ دہلی
۴۷ - شبیر احمد عثمانی، مولانا	ترجمہ قرآن مجید	مطبوعہ دہلی
۴۸ - عبد الباری ندوی، مولانا	تجدید تصوّف و سلوک	نامی پریس لکھنؤ ۱۹۴۹
۴۹ - غزالی، حجۃ الاسلام ابو حامد محمد	احیاء العلوم	نئی دہلی ۱۹۸۸ء
	خلاصہ المرشد الامین	
۵۰ - " "	منہاج العابدین	مصر ۱۳۱۷ھ

۵۱-	قاضی بیضاوی، شافعی	تفسیر بیضاوی	منشی نولکشور لکھنؤ ۱۲۸۲ھ
۵۲-	مجدّد الف ثانی، امام ربّانی	مکتوبات	مطبوعہ حیدرآباد دکن
۵۳-	محمد بن عبدالکریم شہرستانی، علامہ	الملل والنحل	طبع مصر
۵۴-	محمد صالح عثیمین	القواعد المثلیٰ فی صفات اللہ واسمائہ الحسنیٰ	جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ سعودی عربیہ ۱۴۰۵ھ
۵۵-	محمد بن علی شوکانی، علامہ	فتح القدیر	مصر ۱۳۸۳ھ/۱۹۴۶ء
۵۶-	" "	تحفۃ الذاکرین شرح عدۃ الحصن الحصین	طبع مصر
۵۷-	محمد بن جریر طبری، امام	جامع البیان (تفسیر طبری)	مصر ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء
۵۸-	محمد حفظ الرحمٰن، مولانا	اسلام کا معاشی نظام	ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۴۶ء
۵۹-	محمد احمد باشمیل	غزوۂ احد	دارالکتب۔ بیروت
۶۰-	نووی، امام	شرح مسلم	کتب خانہ رشیدیہ دہلی ۱۳۷۶ھ
۶۱-	نئی دنیا	ہفت روزہ (اردو) دہلی	جولائی واگست ۱۹۸۸ء
۶۲-	یاقوت حموی، علامہ	معجم البلدان	مصر ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء

Bertrand Russell, History of Western Philosophy, London, 1957, -۶۳

D.C. Somervell, A History of our Religion London, 1945 -۶۴

Encyclopaedia of Islam, Leiden, 1934, 1960 -۶۵

Encyclopaedia Britan... -cropaedia, 15th Ed. 1973. -۶۶

John William Draper, History of the Intellectual Development of Europe London, 1864. -۶۷

Mohammad Ḥusayn Haykal, The life of Mohammad Trs. Ismāil A. Al-Fārūqī (8th Ed.) crescent Publishing Company, ALIGARH -۶۸

مجمع البحوث العلمیۃ الاسلامیۃ انتاجات کے آئینہ میں

(الف) مطبوعات

(۱) کیا مُردے سنتے ہیں ؟
(۲) الزهر النضر فی حال الخضر (عربی)
(۳) شراب اور نشہ آور اشیاء کی حرمت و مضرت
(۴) شیخ عبدالرحمٰن عبدالخالق سے ایک اہم انٹرویو
(۵) Alkhutoot Al-Areedah (انگلش)
(۶) The True Religion (انگلش)
(۷ – ۱۴) خلیجی بحران سے متعلق آٹھ (۸) پمفلٹ
(۱۵) زوابع فی وجہ السنہ قدیمًا وحدیثًا (عربی)
(۱۶) دعوۃ شیخ الاسلام ابن تیمیہ واثرها فی الحرکات الاسلامیۃ المعاصرۃ (عربی)
(۱۷) دعائیں
(۱۸) توحید کا قرآنی تصور

(ب) زیر طبع

(۱۹) زاد المعاد (اردو)
(۲۰) تقویۃ الایمان (اردو)